مصنفہ

سرکار سید العلماء

مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

تعارف

یہ کتاب پیغمبر اسلام، رسول خدا، نبی آخر، محمد مصطفیٰ کی مختصر ترین سوانح عمری بلکہ حالات کے اختصار کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ بالکل ناواقف افراد کے لیے ایک مجمل تعارف ہے۔

تعفن اور گندگی سے بھری ہوئی موجودہ دنیا کے لیے شدید سے شدید تر ضرورت ہو کہ آپ کی انتہائی جامع سوانح عمری موجودہ دماغوں کے مطابق مختلف زبانوں میں شایع کی جائے۔

آپ کے مقصد کی بلندی، طینت کی نیکی، قول کی سچائی، عمل کی پختگی اور ارادے کی مضبوطی نے جب عرب کے سے جاہل ترین۔ وحشی اور جنگلی بدوؤں کی فطرت بدل کر اُن میں انسانیت بھر دی، وہاں کی اُسر، بنجر زمین اور ریگ کے تودوں میں لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب باغات لگا دیئے تو موجودہ دنیا جس کو بے حد متمدن کہا جاتا ہے ایسی کہاں کی گئی گذری ہے جو آپ کے تعلیمات سے متاثر نہ ہوگی بلکہ ضرور اثر لے کر رہے گی۔

مادیت اور لامذہبیت کا پرچار کرنے والے، سفاکیت اور بربریت کو بلندی دینے والے، اُخوت و محبت کا گلا گھونٹنے والے، ہمدردی و ایثار کو ملیامیٹ کرنے والے، خود کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر اب پھر مذہب کی طرف مُڑ رہے ہیں۔ اس وقت کچھ دُھن کے پکے بات کے دھنی کمر ہمت باندھ کر محمد مصطفیٰ اور علی مرتضیٰ کے سوانح حیات شائع کرنے اور نشر کرنے پر تُل جائیں تو دنیا بہت کچھ نیکیوں سے پُر ہو سکتی ہے۔ کاش ایسا ہو سکتا۔

خادم مشن

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی محمد سید الانبیا
والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین -

اسلام نے ایک "نظامِ تمدن" کی حیثیت سے تاریخ عالم میں جو نمایاں جگہ حاصل کی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے "پیغمبر اسلام" کی سیرت زندگی میں صرف اس مذہب کے پیروؤں ہی کے لیے ایک مقدس اور بابرکت ذکر سمجھ کر جاذبیت نہیں ہے بلکہ تاریخ عالم میں انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقاء کی ایک نمایاں منزل ہونے کی بنا پر اُسے مشترکہ اہمیت حاصل ہے۔

یہ بدقسمتی ہے کہ آج کل کالجوں اور اسکولوں کے مسلمان بچے بھی دوسرے فلاسفر و حکماء وغیرہ کے حالات زندگی سے بہ نسبت اپنے رسول کے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

مقدس رہنمایانِ دین کے مختصر حالات کا یہ سلسلہ اسی لیے شروع کیا جا رہا ہے کہ جنہیں بڑی بڑی کتابوں کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہے وہ ان مختصر حالات کو پڑھ کر محفوظ رکھ سکیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی حضرت ختم الانبیاء پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس حالات کے ماتحت اس رسالہ کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔

نام و نسب :- حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں ایک فرزند اسحٰق کی اولاد

سے بنی اسرائیل تھے جن میں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور بہت سے دوسرے پیغمبر ہوئے۔
اور دوسرے فرزند اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں میں قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہو
گئی جن میں عدنان سب سے زیادہ مشہور تھے۔ پیغمبر اسلام ان ہی کی اولاد میں سے تھے
آپ کا نسب نامہ عدنان تک اس طرح ہے۔

محمد ابن عبد اللہ ابن عبد المطلب، ابن ہاشم، ابن عبد مناف، ابن قصی، ابن کلاب
ابن مرہ، ابن کعب، ابن لوی ابن غالب، ابن فہر، ابن مالک، ابن نضر، ابن کنانہ، ابن خزیمہ
ابن مدرکہ، ابن الیاس، ابن مضر، ابن نزار، ابن معد، ابن عدنان۔

ان میں سے نضر بن کنانہ کی اولاد قریش کہلاتی تھی۔ حضرت کی والدہ آمنہ
بنت وہب، ابن عبد مناف، ابن زہرہ، ابن کلاب، ابن مرہ تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ
حضرت ماں اور باپ دونوں طرف سے قریش کے ممتاز قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ولادت | ۵۷۰ء عیسوی میں جس سال ابرہہ حبشی نے خانۂ کعبہ پر ہاتھیوں کی
فوج کے ساتھ فوج کشی کی ہے جس سے عربوں نے "عام الفیل" کے نام سے سنہ
مقرر کر لیا، اسی سال جمعہ کے دن ۱۷ ربیع الاول کو حجاز کی سرزمین مکہ پر حضرت کی
ولادت ہوئی۔

یتیمی | تاریخی حیثیت سے یہ مسلم ہے کہ حضرت کے سر پر باپ کا سایہ دنیا میں
باقی نہیں رہا۔ آپ کے والد جناب عبد اللہ کا انتقال ہو گیا، اسی وقت جب آپ ابھی
ماں کے پیٹ میں تھے یا پیدا ہونے کے بعد آپ دو مہینے یا سات مہینے کے تھے یا زیادہ
سے زیادہ دو برس یا دو برس اور چار مہینے، یہ آخری مدت ہے۔ بہرحال مورخین
میں اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس میں کوئی قابل اطمینان فیصلہ دشوار ہے۔

صورت حال کی حسرت خیزی اور بڑھ جاتی ہے اس سے کہ چھ سال کی عمر جب ہوئی تو
شفیق ماں کا بھی سایہ سر سے اٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت کی مرضی یہی تھی کہ تمام
عالم کو اپنی محبت و شفقت کے سایہ میں جگہ دینے والا خود باپ اور ماں دونوں کے
سایۂ عاطفت سے کمسنی ہی میں محروم ہو جائے۔

تربیت | قبیلۂ بنی سعد میں سے حلیمہ وہ خوش قسمت خاتون تھیں جو رسول اللہ کی
رضاعت (دودھ پلانے) کے لیے مقرر ہوئیں اور اس دوران میں انھوں نے آپ کو
اپنے گاؤں میں رکھا اس کے بعد چھ برس کے سن تک آپ اپنی والدۂ گرامی کے ساتھ
رہے۔ جب ماں کا بھی سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنے
پاس بلا لیا اور اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت و شفقت کے ساتھ آپ کی پرورش شروع کی۔ مگر دو برس کے بعد
جناب عبدالمطلب کا بھی وفات ہو گئی۔ انھیں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں فکر تھی تو اس بچہ کی
حفاظت و نگہداری کی جس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ آگے چل کر دنیا کے سامنے اس کا بہت
بڑا مرتبہ نمایاں ہوگا۔ اس لیے جب اپنی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تو انھوں نے اپنے
فرزند ابوطالب کو بلا کر محمدؐ کو ان کے سپرد کر دیا حالانکہ دوسرے بھائی سن میں
ان سے بڑے موجود تھے مگر عبدالمطلب کی نگاہ دوربین دیکھ رہی تھی کہ محمدؐ کے لیے جس طرح
ابوطالب جاں نثاری کے ساتھ خدمات انجام دیں گے اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے گا

چنانچہ ابوطالب نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہر طرح کے سخت سے سخت
اوقات میں محمد مصطفیٰؐ کی نصرت و حمایت میں اس فرض کو پورا کیا جو وہ بزرگ مرتبہ باپ
عبدالمطلب سے [illegible] آخری [illegible] کے عالم میں کر چکے تھے
آٹھ برس کے سن سے اپنی زندگی بھر رسولؐ کے ساتھ ان کے چچا ابوطالب وہ محبت

صرف کرتے رہے چچا اپنی اولاد کے ساتھ صرف کرتے تھے اور چچی فاطمہ بنت اسد وہ شفقت کرتی تھی جس سے رسول کو ماں کی محبت کا لطف حاصل ہو جاتا تھا اس لیے آپ نے خود فاطمہ بنت اسد کے انتقال کے موقع پر یہ لفظیں فرمائیں کہ "یہ میری ماں کے بعد میرے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں"

شام کا پہلا سفر جب حضرت کی عمر ۱۲ برس کی تھی تو ابوطالبؑ نے تجارت کے لیے شام کی جانب سفر کیا۔ اس سفر میں آپ بھی اپنے چچا کے ساتھ گئے اور اسی ذیل میں بحیرا راہب نے آپ کو دیکھ کر ان آثار کی بنا پر جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں مذکور تھے کہا کہ یہ بچہ نبی ہونے والا ہے اور اسے بڑا اقتدار حاصل ہوگا۔ یہ ملاقات بحیرا سے اثنائے راہ میں صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوئی۔ اس کی کوئی غلط روایت بھی اس کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے وہاں کچھ عرصہ تک قیام کیا ہو۔

حلف الفضول میں شرکت جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں حلف الفضول کا عہدنامہ ہوا کہ جو بے نظیر شریفانہ اصولوں پر مبنی تھا۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد قبائل عرب میں طلق العنانی اور بے آئینی پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ پردیسیوں کے جان و مال مکہ میں محفوظ نہ رہے تھے۔ اس لیے بنی ہاشم کی دعوت پر زہرہ اور تیم کے قبیلے بھی متفق ہوئے اور سب نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہو کے یہ عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ اس کی شکایت رفع نہ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کی حق کوشی میں معاونت کریں گے۔ اس معاہدہ میں حضرت محمد مصطفےٰ نے بھی شرکت فرمائی۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد جب عرب کے دوسرے زمانہ جاہلیت کے معاہدات کالعدم کر دیے گئے تھے

تو بھی آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اُس کی آواز پر لبیک کہوں گا۔

سفرِ تجارت

رسول کی عمر پچیس سال کی تھی جب آپ خدیجہ بنت خویلد کے اموالِ تجارت کو لے کر شام کی طرف گئے یہ تجارت کی مہم اتنی کامیابی کے ساتھ انجام پائی کہ جتنا نفع ہر سال خدیجہ کو ہوا کرتا تھا اُس سے دونا نفع اس سال ان کو حاصل ہوا۔

شادی

تجارتی معاملات کے ذیل میں رسول کے محاسن اخلاق، امانت و دیانت اور بلندی ذات و صفات کا جناب خدیجہ کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑ چکا تھا اور خود جناب خدیجہ کے حسن معاملت اور کردار کا رسول خدا کی نظر میں بھی وزن تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ کو جناب خدیجہ کے ساتھ شادی کے پیغام دینے کی طرف متوجہ کیا گیا تو آپ نے صرف یہ عذر فرمایا کہ خدیجہ کافی مالدار ہیں، میری اتنی مالی حیثیت نہیں ہے کہ میرے ساتھ وہ شادی پر تیار ہو سکیں لیکن درمیانی شخص نے جب اُن کے رضامند ہونے کی ذمہ داری لی تو آپ نے بخوشی پیغام دینا پسند فرمایا۔ وہی ہوا کہ جناب خدیجہ نے اسے فوراً منظور فرما لیا چنانچہ تاریخ عقد مقرر ہوئی جناب خدیجہ کی طرف سے اُن کے چچا عمرو بن اسد نے اور حضرت کی جانب سے آپ کے چچا ابوطالب نے خطبۂ عقد اور ایجاب قبول کے مراسم ادا کیے۔ باوجودیکہ جناب خدیجہ عمر میں حضرت سے کافی زیادہ تھیں مگر اُن کے حسن سیرت کی آپ کی نظر میں اتنی عزت تھی کہ آپ نے اُن کی زندگی میں کبھی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں فرمایا۔

سیرت کی بلندی۔ بچپن سے جوانی تک کی زندگی کے تجربات نے عربوں پر یہ

اثر کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر آپ کی راست بازی اور امانت داری کو تسلیم کر لیا اور آپ کو صادق اور امین کے القاب سے یاد کرنا اور اپنی امانتوں کو آپ کے پاس رکھوانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے مشوروں کو قابل قبول سمجھنے لگے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر حجر اسود کے نصب کرنے کی عزت حاصل کرنے کی کوشش میں مختلف قبیلوں کے درمیان جو تنازع کی صورت ہوگئی تھی وہ آپ ہی کے حکیمانہ فیصلہ سے دور ہوئی اور سب نے اس کو بخوشی تسلیم کر لیا۔

بعثت حضرت کی عمر چالیس برس کی تھی جب آپ ۲۷ رجب کو تبلیغ رسالت کے فریضے پر مامور ہوئے اور عملی طور پر خداوندی پیغام کے حامل قرار پائے۔ آپ نے بحیثیت رسول اپنے پیغام کو سب سے پہلے اپنی رفیقۂ حیات خدیجہ بنت خویلد تک پہونچایا جس پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں۔ اور آپ کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالبؑ جو برابر آپ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور آپ کی رسالت کی عظمتوں کے پہلے سے عینی شاہد تھے۔ آپ کے دعوائے رسالت کے سب سے پہلے گواہ بنے۔ پھر روز بروز دوسرے افراد تک بھی یہ آواز پہونچی گئی اور اکا دکا لوگ آپ کے دعوے پر ایمان لاتے رہے مگر ابھی تک تبلیغ رسالت رازداری کے ساتھ خاص خاص لوگوں کے سامنے کی جاتی تھی اور علی الاعلان اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقع نہ آیا تھا۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے انھیں بھی حکم یہی تھا کہ وہ مخفی طور پر اپنے مذہبی فرائض انجام دیں اور اس کی عام اشاعت نہ کریں۔

دعوت عشیرہ تین برس اس طرح رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا ہونے کے بعد دوسری منزل یہ تھی کہ اپنے قریبی عزیزوں کے مجمع میں اعلان کا حکم آیا۔ آپ نے حضرت علی بن ابی طالب کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو چنانچہ

سامان دعوت کیا گیا اور اس میں تمام قریش کے ممتاز افراد کو مدعو کیا گیا سب جمع ہوئے کھانے کے
بعد حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دنیا اور آخرت دونوں میں بہتری کی
ضامن ہے میں خلق خدا کو توحید اور اصلاح عمل کی طرف بلانے پر مامور ہوں تم میں سے کون ہے
جو اس مہم میں میرا ساتھ دے گا تاکہ وہی میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہو۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔
کسی نے کچھ جواب نہ دیا مگر صرف ایک نوجوان کمسن بچہ تھا جو اٹھ کھڑا ہوا اور کہا میں آپ کا اس مہم میں شریک و
بازو ہوں گا یہ علی بن ابی طالب تھے جو عملی طور پر پہلے ہی سے رسولؐ کے بازو بنے ہوئے تھے اور اسی
طرح وہ تمام مجمع کے سامنے بھی عہد وفاداری کر رہے تھے پیغمبر نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ بس یہ میرا
رفیق میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

<u>مصائب و شدائد</u> | رسول نے قریش کے سامنے علانیہ بت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ
شروع کر دی۔ قریش آپ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے مگر ابوطالب کی شخصیت سے جو آپ کی محافظ
تھی وہ مجبور ہو رہے تھے آخر ان میں کے جو ممتاز افراد تھے وہ مل کر ابوطالب کے پاس آئے اور بہت تلخ
الفاظ میں رسول کی شکایت کی اور کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو روکیے اور یا آپ درمیان سے ہٹ جائیے۔
ہم ان سے سمجھ لیں گے ابوطالب نے حضرت سے اس کا تذکرہ کیا آپ نے فرمایا کہ یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج
اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہو سکتا ابوطالب نے ان لوگوں کو جواب
صاف دے دیا جس سے ان کی عداوت کا شعلہ اور زیادہ بھڑک گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان غریب
مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچانے لگے جنھوں نے رسالت پیغمبر پر ایمان قبول کیا تھا

<u>ہجرت اولیٰ</u> | بعثت کے پانچویں سال مسلمانوں پر مظالم بہت بڑھنے لگے تو آپ نے اپنے صحابہ کو ملک حبشہ کی طرف ہجرت
کر جانے کی اجازت دے دی [illegible] مسلمان حبشہ کی طرف روانہ ہوئے ان مہاجرین کے سرگروہ جعفر بن
ابی طالب تھے جنھوں نے [illegible] نجاشی بادشاہ کے دربار میں اسلامی تعلیمات کی ترجمانی اور تبلیغ

کا بھی فرض انجام دیا جس سے بادشاہ اور ارکانِ سلطنت کے دل پر اسلامی مذہب کی عظمت کا سکہ جم گیا اور مسلمانوں کو وہاں اطمینان و سکون کے ساتھ قیام کا موقع ملا۔

محاصرہ حبشہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے حالات کو سن کر مشرکین کے بغض و حسد میں اور ترقی ہوگئی اور انھوں نے آپس میں متفق ہو کر یہ طے کیا کہ بنی ہاشم کا پورے طور پر بائیکاٹ کیا جائے نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز نہ سمجھا جائے بلکہ اُن سے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے بلکہ یہاں تک کہ ضروریاتِ زندگی پانی اور کھانا تک پہونچنے نہ دیا جائے۔ ناچار ابوطالب نے رسول کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال کا ہے اور تین برس مسلسل یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میں حضرت رسول خدا اور آپ کے ساتھ تمام بنی ہاشم کو سخت تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا یہاں تک کہ کئی کئی وقت ایسے گزر جاتے تھے کہ آب و طعام میسر نہ آتا تھا تین برس کے بعد یہ بائی کاٹ ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکل سکے۔

دو بڑے صدمے افسوس ہے کہ اس محاصرہ کے ختم ہونے سے دو ہی مہینے کے بعد بعثت کے دسویں سال ابوطالب کا اور اُن کے صرف پینتیس دن بعد خدیجہ بنت خویلد کی وفات ہوگئی۔ ان دونوں آدمیوں کی رحلت کا رسول اللہ کو شدید صدمہ پہونچا۔ اسی سے آپ اس سنہ کو "عام الحزن" (رنج کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

طائف کا سفر ابوطالب کے بعد قریش کی ایذا رسانی بہت بڑھ گئی۔ وطن کی زمین رسول کے لیے خارزار بن گئی۔ آپ کو اسلام کی اشاعت کے لیے اب کسی مناسب مقام کی تلاش بھی تھی، چنانچہ آپ نے بعثت کے دسویں برس کے آخر میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک داعی حق کی حیثیت سے طائف کی طرف سفر کیا بالکل بے زاد و بے توشہ صرف زید بن حارثہ کو ساتھ لیے ہوئے آپ نے عرب کے اس سرسبز مقام پر دس دن قیام کیا اور فرداً فرداً اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہونچایا مگر افسوس کہ

ہدایت کی کھیتی کے لیے یہ شاداب زمین بھی اور سازگار بھی ثابت ہوئی نہ صرف یہ کہ اُن لوگوں نے آپ کی آواز پر لبیک نہیں کہی بلکہ اپنے یہاں ٹھہرنے بھی نہیں دیا اور جسم مبارک پر پتھر برسائے آپ پھر مکہ معظمہ واپس آئے مگر یہ تمام مشکلات آپ کے قدم کو راہ حق میں مسلسل کوشش سے باز نہ رکھ سکے۔

انصار کی ملاقات | مکہ معظمہ میں ہر سال ذی الحجہ اور شعبان کے مہینوں میں بازار لگتے تھے اور اُن میں مختلف اطراف و جوانب سے قبائل جمع ہوتے تھے اس موقع پر شعرائے عرب اپنے قصیدے سناتے تھے تجار اپنے اموالِ تجارت لا کر فروخت کرتے تھے اور رسول کا کام یہ تھا کہ وہ قبائل عرب کے سامنے اپنے پیغامِ توحید کو پیش کریں اُن کو اپنی حمایت و نصرت کی دعوت دیتے تھے مگر دعوتِ حق کی آواز اُن ہی دلوں پر اثر کیا کرتی ہے جن میں کسی حد تک صلاحیت و قبول کی رمق موجود ہوتی ہے جبکہ اکثر قبائل بجائے دعوت کے حضرت کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ایذا رسانی پر آمادہ ہوتے تھے۔ شہر یثرب کی سرزمین کی ایک جماعت خوش قسمتی سے اس صدا سے متاثر ہو گئی اور انھوں نے حلقۂ حق کو قبول کر کے آپ کی امداد و نصرت کا وعدہ کر لیا۔ یہ تھا انصار کا پہلا گروہ جو شرف اسلام سے مشرف ہوا اور پھر انھوں نے اپنے شہر جا کر رسول کا پیغام پہونچایا اور بہت افراد نے غائبانہ آپ پر ایمان اختیار کیا۔ دوسرے سال اُن میں کے بارہ آدمی رسول سے آ کر ملے اور آپ سے عقائد اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی اور تیسرے سال ستر آدمیوں نے حاضر ہو کر اس سعادت کو حاصل کیا۔ اب مدینہ میں اسلام کافی طور پر پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے جن میں سے اکثر صرف تعلیمات اسلامی سے متاثر ہو کر اس سعادت کو حاصل کر رہے تھے اور ابھی ان کو آنکھوں سے رسول کے چہرۂ مبارک کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔

مدینہ کی طرف ہجرت | یثرب میں اسلام کی کامیابی کی خبریں سن سن کر اہل مکہ کا غیظ و غضب بڑھتا جاتا تھا اور وہ اب مسلمانوں کو اور زیادہ ناقابل برداشت تکلیفیں پہونچانے لگے۔ آخر رسول خدا نے اُن کو

یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دی اور رفتہ رفتہ اکثر مسلمان مکہ سے نکل گئے صرف رسولِ خدا، علی مرتضیٰ
اور چند دوسرے مسلمان باقی رہ گئے۔ اب مشرکین کو یقین ہو گیا کہ رسالت مآب کو یثرب میں ایک محفوظ ٹھکانہ حاصل
ہو گئی ہے عنقریب یہ خود بھی وہاں پہنچ جائیں گے تو ہمارے مقابلہ میں ان کو بڑی طاقت حاصل ہو جائے گی
اس لیے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ
کے چراغِ زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔

حضرت رسول کو اس کی اطلاع پہنچ گئی اور آپ نے یہ طے فرما لیا کہ آپ اپنے بستر پر علی بن ابی طالب
علیہ السلام کو لٹا کر خود مخفی طریقہ سے زمین مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں چنانچہ حضرت علی بن ابی
طالب نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر رسول کے بستر پر آرام کیا اور حضرت دشمنوں کی نگاہوں سے مخفی
رہ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اس اہم واقعہ کو ہجرت کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں میں ہجری تاریخ
کی ابتدا ہوئی ہے جسے اس وقت تک تیرہ سو سڑسٹھ برس پورے ہو چکے ہیں۔

مسجد نبوی کی تعمیر سب سے پہلا کام جو رسول نے مدینہ پہنچ کر کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی جس میں
تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسول بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لانے میں شریک تھے شروع شروع میں ایک قد
آدم اونچی چار دیواری پر اکتفا کی گئی بعد میں نمازیوں کو گرمی سے تکلیف ہوئی تو تنہا کھجور کے درخت تنوں کا
ایک سائبان ڈلوا دیا لیکن چھت باوجود اصحاب کے اصرار کے منظور نہیں فرمائی۔ اس مسجد کے گرد چھوٹے
چھوٹے مکانات اپنے اعزا اور بعض دیگر معتمد اصحاب کے لیے بنوائے جن کے دروازے پہلے مسجد ہی میں کھلتے تھے
مگر بعد کو سوائے حضرت علی بن ابی طالب کے اور سب کے دروازے مسجد کی طرف بند کر دیے گئے اور آمد و
رفت باہر سے قرار دے دی گئی۔

جہاد جب قریش کو معلوم ہوا کہ رسول بخیر و خوبی مدینہ پہنچ گئے اور ان کا مذہب دن
دونی ترقی کر رہا ہے تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور وہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ

مل کر کوششیں کرنے لگے کہ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دیں اس کے نتیجہ میں حضرت کو مشرکین قریش
اور یہودیوں کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں سے اہم موقعوں پر حضرت خود فوج
اسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ایسی مہموں کو "غزوہ" کہتے ہیں اور جن موقعوں پر آپ اپنے اصحاب
میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیج دیا کرتے ہیں، ان کو "سریہ" کہا جاتا ہے غزوات کی مجموعی
تعداد چھبیس ہے جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین بہت مشہور ہیں اور سریوں کی
تعداد چھتیس تھی جن میں سب سے مشہور جنگ موتہ ہے جس میں جعفر طیار شہید ہوئے۔

صلح حدیبیہ | بدر و احد کی لڑائیوں کے بعد جب کچھ عرصہ تک مشرکین مکہ کی طرف سے
کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوئی تو ہجرت کے چھٹے سال حضرت نے مکہ معظمہ کے حج کا ارادہ کیا اور
مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسول کی آمد کی اطلاع
ہوئی تو وہ مکہ سے باہر نکل کر رسول کا راستہ روکنے پر تیار ہوگئے اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں
سے آپ کا شہر مکہ میں ورود نہیں دیکھ سکتے مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسول نے امن پسندی
سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ ایک تحریری صلح نامہ کر دیا۔ اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علی بن ابی طالب
تھے جس کے شرائط حسب ذیل تھے۔

(۱) رسول اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر حج کیے ہوئے واپس جائیں۔

(۲) دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہ ہو۔

(۳) اگر مکہ والوں میں سے کوئی جا کر مسلمانوں میں شامل ہو جائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اسے مشرکین کو دیدیں

(۴) اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آ جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۵) عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار رہے گا چاہے وہ رسول اسلام کے ساتھ معاہدہ کرلیں یا مکہ والوں
کے ساتھ ہو جائیں۔

(۶) سال آئندہ مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کر سکیں گے

(۷) مسلمان اس موقع پر اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھ کر آ سکیں گے۔

بعض مسلمان اس معاہدہ کے غیر منصفانہ شرائط پر بڑی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے مگر حضرت رسول نے اس لیے کہ جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد نہ ہو، ان شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لیے تشریف لے گئے اور حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے۔

فتح مکہ کچھ ہی عرصہ کے بعد مکہ والے اس معاہدہ پر جو رسول اللہ کے ساتھ کیا گیا تھا قائم نہیں رہے اور قبیلہ خزاعہ کو جو پیغمبر اسلام کا حلیف تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تنگ کر دیا جب حضرت کو یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف قبیلہ کی امداد کیلیے فوراً روانہ ہو گئے اور دس ہزار مسلمانوں کی فوج کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئے مشرکین میں اب مقابلہ کی طاقت باقی نہ تھی انھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا اور ماہ رمضان ۸ھ ہجری میں آپ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے اب پیغمبر اسلام کا رحم و کرم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان لوگوں کی جانب سے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچی تھیں جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا تھا فتح کے وقت تمام غلطیاں معاف کر دی گئیں۔ فتح کے موقع پر جب لوگ آپ کی بیعت کر رہے تھے تو آپ نے اُن سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو سب نے جواب دیا کہ ہمیں اچھائی ہی کی امید ہے آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے فرزند ہیں آپ نے فرمایا جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔

دنیا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ رسول خدا نے ابو سفیان کو اُس کی بیوی ہندہ کو جس نے حضرت حمزہ کی شہادت کے بعد اُن کا کلیجہ نکلوا کر چبایا تھا، وحشی کو جس نے حمزہ کو شہید کیا تھا عکرمہ ابو جہل کے بیٹے اور ایسے ہی کئی اشخاص کو جنھوں نے سخت اذیتیں پہونچائی تھیں اور شدید جرائم کے مرتکب ہوئے تھے آج ظاہری اسلام قبول کرنے کے بعد بغیر کسی شرط کے معاف کر دیا مگر ... آپ حضرت نے ڈیڑھ ماہ مکہ میں قیام

فرمایا اور ملکی انتظام کے لیے وہ اصول جاری کیے جو مہذب قوموں کی تہذیب کی آج بھی نشانی بن سکتے ہیں
حجۃ الوداع ۱۰ھ میں حضرت نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ارکان حج ادا کیے۔

واپسی میں بمقام غدیر خم پر تمام اطراف و جوانب کے مسلمانوں کے مجمع میں یادگار تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے اپنی وفات کے قریب ہونے کی دردناک خبر سناتے ہوئے ان سے اس طرح اقرار لیا کہ میں تمہارے بارے میں خود تم سے زیادہ اختیار رکھتا ہوں یا نہیں جب سب نے تسلیم کیا کہ بے شک آپ ہم پر ہم سے زیادہ اختیارات رکھتے ہیں تو آپ نے حضرت علی بن ابی طالب کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کے سامنے اونچا کیا اور فرمایا کہ جو اختیارات مجھے تمہاری نسبت حاصل ہیں وہی علی کو تمہاری نسبت حاصل ہوں گے اس طرح آپ نے اپنے بعد کے لیے اپنے جانشین کے نام کا اعلان فرمایا مسلمانوں نے اس پر بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور عام طور سے اس وقت علیؑ رسول کے جانشین تسلیم کر لیے گئے۔

اصول تعلیم اور اخلاق و خصائل پیغمبر اسلام کی تعلیم کا خاص جوہر تمام افراد انسانی کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی طرف متوجہ کرنا تھا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے ہیں خالق کی توحید اور خلائق کا اتحاد، یہی وہ بنیادی اصلیں تھیں جن پر حقوق اللہ اور حقوق الناس کی عمارت بلند ہوئی اور تاریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا ہوئے جن سے وہ قومیت، رنگ، جنس یا غربت و فلاکت کی بنا پر محروم رکھے جاتے تھے اس نے پہلے کے تمام ترقی اور بلندی کے امتیازات مٹا کر ایک نیا امتیاز کا معیار قائم کیا اور وہ یہ کہ فضیلت اعمال و افعال کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص فرد نفس انسانی کو سب سے زیادہ انعام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

اخلاق پر بہت زور دیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ "میں بھیجا گیا ہوں صرف اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے"
آپ کے ذاتی اخلاق و خصائل بھی اسی مقصد کے ترجمان تھے آپ اتنی بڑی اسلامی جماعت کے سردار رہتے ہوئے فقراء اور مساکین کے ساتھ زانو سے زانو ملا کر بیٹھے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے تھے رات رات بھر

عبادت خدا ہوتی تھی اتنی کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا اور دن بھر تمام قبائل عرب اور مختلف قوموں کے وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، مسائل کا تصفیہ ہوتا تھا اور بڑے بڑے قضیے حل کیے جاتے تھے۔ ایک انگریز مورخ (باسورتھ سمتھ) نے لکھا ہے کہ تاریخ میں محمد کی ہی ہستی ہے جس کے ایک وقت میں تین الگ الگ کام انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی یعنی یہ کہ حضرت ایک قوم کے بانی ہوئے۔ ایک نئے نظام سلطنت کے بانی ہوئے اور ایک مذہب کے بانی ہوئے ہیں، ایسی مثال کوئی دوسری نہیں مل سکتی اس کے ساتھ آپ نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہیبت سے کانپنے لگا آپ نے فرمایا اطمینان رکھو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھے ہوئے گوشت کو جوش دے کر اس کا شوربا کھانا کھاتی تھی اسی مناسبت سے آپ کی عادتیں نہایت سادہ تھیں گھر کے وقت مزدوروں کی طرح کام کرتے بازار سے اپنا سودا خرید کر لاتے بلکہ ہمسایوں کو بھی خرید کر لا دیتے تھے عفو و کرم آپ کا شعار اور سختی برداشت کرنا اور عزم و اطمینان کے ساتھ عمل کے جادہ پر قائم رہنا آپ کی سیرت میں نمایاں تھا۔

آپ کا عمل آپ کی تعلیم کا مفسر اور آپ کی تعلیم آپ کے عمل کا خلاصہ تھی آپ کے طرز بیان کی خاص خصوصیت جامعیت تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں آپ نے وہ اصول ودیعت کر دیے ہیں جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

قرآن مجید | قرآن حقائق و معارف کا وہ خزانہ اور حیات انسانی کا وہ مکمل دستور ہے جو آپ کے ذریعہ سے اہل عالم کی ہدایت کے لیے پیش ہوا اور کروڑ در کروڑ انسانوں نے اس وقت سے اب تک اس کے تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور ہزاروں ایسے افراد نے بھی جو مذہبی طور سے اس پر ایمان کا اقرار نہیں رکھتے اس کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔

وفات | دوشنبہ کا دن دوسری ربیع الاول ۱۱ھ یا ایک قول کی بنا پر ۱۲ ربیع الاول کی وہ قیامت خیز تاریخ تھی جب چند روز بیمار رہنے کے بعد مصلح عالم پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی حسب وصیت آپ کے بھائی اور جانشین حضرت علی بن ابی طالب نے آپ کی تجہیز و تکفین فرمائی اور آپ کی مسجد کے پاس اسی حجرہ میں جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی دفن کیا۔

مدینہ منورہ میں آپ کا قبۂ خضرا مسلمانان عالم کی زیارت گاہ ہے۔ جہاں حج کرنے والے حج سے پہلے یا بعد جاتے ہیں اور مسجد نبوی و روضۂ رسول کی زیارت کا شرف حاصل کرتے رہتے ہیں۔

رسالہ نمبر ۱۱۱ - امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

سیّدۂ عالم

از سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت : ۲؍
محصول ڈاک : ۵؍

تعارف

زیر نظر رسالہ چہاردہ معصومین کی سوانح عمریوں کی آخری کڑی ہے۔ اس سے پہلے تیرہ معصومین کے سوانح حیات نذر ناظرین کیے جا چکے ہیں۔ ان رسالوں کا مقصد صرف معصومین کی پاک و پاکیزہ شخصیتوں کو دنیا سے روشناس کرانا ہے۔

اب اگر زمانہ نے مساعدت اور افراد قوم نے اعانت کی تو ادارہ مشن دنیا کے ان بزرگ ترین آئیڈیل (مثالی) انسانوں کی جامع سوانح عمریاں شائع کرے گا جن کے مجموعی مطالعہ سے دنیا کا ہر ذی فہم انسان شائستگی اور آشتی سے بھرا ہوا ایک بہترین اور مکمل ترین نظام زندگی حاصل کر سکے گا۔

خادم مشن

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سیدنا محمد

وآلہ الطاہرین

نوعِ انسانی کی دو صنفیں ہیں۔ ہر ایک کے لیے کمالِ اخلاق کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ وہ ہستیاں ہیں جو اس صنف سے متعلق ہوتے ہوئے کمالِ اخلاق کی بلند منزل پر فائز ہوں۔ یہ سلسلۂ رہنمایانِ اسلام میں تیرہ معصوم مردوں کے طبقہ کے لیے نمونۂ عمل ہیں مگر ایک فرد حضرت سیدۂ عالم بضعۃ الرسول فاطمہ زہرا علیہا السلام کی وہ ذات تھی جو طبقۂ خواتین کے لیے معیاری حیثیت رکھتی تھی۔ لہٰذا اس لیے آپ کے حالات کا مطالعہ نوعِ انسانی کا اہم فریضہ ہے۔ حالاتِ معصومین کے سلسلہ کی موجودہ کڑی اسی مقدس ذات کے حالات سے متعلق ہے۔

نام ونسب نام فاطمہ مشہور ترین لقب زہرا اور کنیت "ام ابیہا" تھی۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے بطن سے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرد فرید بیٹی تھیں جن کی نسل پاک سے ہی باپ کے کام اور نام کی بقا رہی اور شاید اسی مناسبت سے آپ کی یہ کنیت ہوئی جس کے معنی ہوتے ہیں "اپنے باپ کی ماں" یعنی وہ خاتون جو اپنے باپ کی زندگی کو پروان چڑھانے کا سبب ہوئی

ولادت یوں تو فرقہ وارانہ اختلافات کے ساتھ بہت سی تاریخی حقیقتیں ایسی ہیں جو مرکزِ اختلاف بن گئی ہیں خصوصاً ولادت اور وفات کی تاریخوں کے بارے میں تو خود ایک فرقہ کی روایات میں بھی اکثر اختلاف ہوتا ہے مگر عموماً یہ اختلاف چند مہینوں یا دو ایک برس سے آگے نہیں بڑھتا لیکن حضرت سیدۂ عالم کی تاریخ ولادت کے بارے میں فرقِ اسلامیہ میں جو اختلاف ہے وہ زمانہ کے ہیر پھیر کے نتیجے میں نو برس کا

کی طولانی مدت کا فرق پیدا کر دیتا ہے اس لیے کہ مؤرخین اہل سنت کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ برس پہلے ہوئی تھی اور فرقۂ شیعہ کی روایات یہ ہیں کہ آپ بعثت سے پانچ برس بعد پیدا ہوئی تھیں۔ ان روایات کی بنیاد اہل بیت معصومین کے ارشادات پر ہے مذہبی طور پر ان روایات کے مستند ہونے کے علاوہ غالباً ہر غیر جانبدار محقق تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ کسی شخصیت اور بالخصوص پردہ نشین خاتون کے متعلق اس کے گھرانے والوں بلکہ اولاد کا بیان جتنا معتبر ہو سکتا ہے اتنا کسی غیر کا بیان معتبر نہیں ہو سکتا۔ ان بیانات کی بنا پر صحیح قول یہی قرار پاتا ہے کہ حضرت سیدۂ عالم ۲۰ جمادی الثانیہ کو بعثت کے پانچویں سال یعنی ہجرت کے آٹھ برس قبل پیدا ہوئیں

تربیت رسولؐ کی بعثت کے ساتویں برس خدیجۂ کبریٰ نے دنیا سے مفارقت کی اس وقت سیدۂ عالم صرف دو سال کی تھیں۔ اتنی مختصر عمر میں ماں کی آغوش شفقت سے جدائی کے بعد آپ کا گہوارۂ تربیت صرف باپ کا سایۂ رحمت تھا اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی تربیت کا آفتاب تھا جس کی شعاعیں براہ راست اس بے نظیر گوہر کی آب و تاب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ عورتوں میں اگر کسی کی صحبت اس عمر میں جناب سیدہ کو حاصل ہو سکتی تھی تو وہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد ہو سکتی ہیں یا آپ کی بہن ام ہانی وغیرہ یا پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب۔ یہ تمام بزرگ خواتین تھیں جو سیدۂ عالم کی شمع عصمت کا پردہ اپنی رہتی ہوں گی اور اسی ماحول میں سیدہ کا بچپنا اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔

غم خواری سیدہ کا بچپن پورا اپنے والد بزرگوار کو اس ناگوار ماحول میں دیکھتے گزرا جو پیام توحید پہنچانے والے کے لیے تھا۔ حضرت ابوطالبؑ و جناب خدیجہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد رسولؐ تھا سیدہ اکثر اپنے باپ کے سر مبارک پر اشاعت حق کے جرم میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا سنتی اور

اُن کے جسم کو پتھروں سے لہولہان دیکھتی تھیں اور اُن منصوبوں کا چرچا اُن کے کانوں تک پہنچتا تھا جو اُن کے والد بزرگوار کے دشمن بلکہ اُن کی زندگی کو بھی ختم کرنے کے لیے قائم کیے جاتے تھے مگر اس کم سنی کے عالم میں بھی سیدۂ عالم نہ ڈریں نہ کبھی گھبرائیں بلکہ اُس ننھی سی عمر میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی مددگار رہیں۔

ہجرت "سیدۂ عالم" کی آٹھ برس کی عمر تھی جب کافروں نے ایکا کر کے ایک شب رسولؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے آپؐ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپؐ کو اس کی اطلاع پہلے ہو گئی تھی اس لیے آپؐ اپنے چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دے کر خود مخفی طریقہ پر مکۂ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؑ بستر رسولؐ پر تھے اور مکان کے اندر حضرت علی بن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد کے ساتھ سیدۂ عالم فاطمۂ زہرا بھی تھیں۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال تھی اور یہ یقیناً آپ کی زندگی کا بڑا امتحان تھا اپنے گھر کے گرد خون کے پیاسے دشمنوں اور اُن کی کھنچی ہوئی تلواروں کا گھیرا تھا جس سے گھر میں رہ جانے والے سب ہی افراد پر ظاہری اسباب کے لحاظ سے دہشت پیدا ہونا چاہیے اور اُدھر باپ کی جدائی کا صدمہ اور اُن کی جان کی حفاظت کا خیال۔ مگر سیدہ نے اسی کم سنی میں اس مرحلہ کو صبر و استقلال سے طے کیا۔ پھر صبح کو جب دشمنوں نے دیکھا کہ رسولؐ چلے گئے ہیں اور اُن کی جگہ پر علیؑ ہیں تو وہ سب گھر کو چھوڑ کر رسولؐ کی تلاش میں چلے گئے اس وقت مکان کے رہنے والوں سے وقتی طور پر خطرہ دور ہو گیا مگر رسولؐ کے متعلق ان کی فکر بڑھ گئی ہو گی۔ پھر چند روز کے بعد علی ابن ابی طالبؑ کا تن تنہا ان خواتین کو محملوں میں سوار کر کے اپنے ساتھ لینا اور مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہونا اور راستہ میں مشرکین کا

آکر سدِ راہ ہوتا اور علیؑ کا تلوار کھینچنا، یہ سب رنگ ان دو بچوں کے لیے کچھ کم دہشت ناک حالات
نہ تھے جو بھی گزر کر سیدۂ عالم اپنے والد بزرگوار کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔

شادی

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ایک سال میں فاطمہ زہرا کی عمر نو برس کی ہو گئی۔ شریعت اسلام
میں یہ سن لڑکی کے بلوغ کا قرار دیا گیا ہے اور یہ تاکید ہے کہ اس کے بعد شادی میں دیر نہ کی جائے۔

اصحاب رسولؐ میں بہت سے افراد رسولؐ کی طرف دامادی کی نسبت حاصل کرنے کے
شرف کی تمنا رکھتے تھے مگر اس کے پہلے صاحبزادی کی کم سنی کا عذر اس سوال میں کاوش بیجا
کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب جبکہ ابتدائی عمر شادی کی آ گئی تو مجسم اخلاق عظیم رسولؐ کی بارگاہ میں
اب پھر ایک عرض تمنا کے لیے آنے لگا مگر رسولؐ کی طرف سے کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ خدا اور رسولؐ
کی نظر میں فاطمہ زہراؑ کے ساتھ شادی کے لیے صرف ایک فرد موزوں تھی جو اب تک خاموش تھی یعنی علیؑ
کی ذات تھی جنھوں نے رسولؐ کی گود میں بچپن سے پرورش پائی تھی اور جس طرح فاطمہؑ اپنے
طبقہ میں آپ کی اخلاقی تعلیم کا بہترین مرقع تھیں اسی طرح علیؑ مردوں میں آپ کے تعلیمات کا مجسمہ
تھے۔ علیؑ کے لیے فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے لیے علیؑ کے سوا برابر کا کوئی دوسرا ہو ہی نہ سکتا تھا
مگر علیؑ رسولؐ سے خواستگاری کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتے تھے اور رسولؐ کو خود تو اس بارے
میں کسی ارشاد کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ جب ہر ایک اظہار تمنا کرنے والے کی خواہش ٹھکرا دی
گئی تو انھی میں سے کچھ نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے تحریک کی کہ آپ بھی رسولؐ کی خدمت
میں جا کر فاطمہؑ کی خواستگاری کریں۔ آخر علیؑ رسولؐ کی بارگاہ میں آئے۔

جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ عرض تمنا کی۔ رسولؐ نے بشاشت چہرہ
کے ساتھ فرمایا کہ "تمہارے پاس مال دنیا سے کچھ ہے؟" عرض کیا "بس گھوڑا، تلوار اور زرہ"۔

فرمایا "گھوڑا اور تلوار تمہارے جیسے مجاہد کے لیے ضروری ہے مگر زرہ نہ اہم ہے اسکو فروخت کر ڈالو"
عام مورخین کی روایت کے مطابق زرہ ۴۸۰ درہم کو فروخت ہوئی۔ اس رقم کو آپ نے بطور مہر سیدۂ عالم رسولؐ
کی خدمت میں حاضر کردیا۔ انہی سے رسولؐ نے فاطمہؑ کی شادی کا سامان کیا اور بیٹی کے لیے نظام خانہ داری
میں جن اسباب کی ضرورت تھی وہ خرید فرمایا۔ وہ کیا تھا۔ ایک چمڑے کا تکیہ کھجور کی چھال سے
بھرا ہوا۔ ایک بچھونا کھال کا اور کچھ مٹی کے برتن۔ ایک مشکیزہ اور ایک چرخہ۔ ان مورخین
کا بیان ہے کہ وہ مہر فاطمہ زہراؑ کا جو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے ادا کیا اور جس پر حضرت
فاطمہ زہراؑ کا نکاح پڑھا گیا چار سو مثقال چاندی تھا۔ تقریباً یہی مقدار پانچ سو
درہم "مہر سنت" قرار پائی ہے۔ بعض روایتوں میں آپ کا مہر بھی پانچ سو درہم بتایا گیا
مگر مہر سنت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہونا فضیلت کے خلاف ہے۔ یا اتنا ہی ہو اور
یا اس سے کم ہو اور اسی لیے فرقۂ شیعہ کے معتبر ترین جوامع حدیث یعنی کتب اربعہ کے بعض
احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا مہر ظاہری طور پر اس عالم
سے بھی جو مہر سنت قرار دیا گیا ہے۔ بہت کم یعنی صرف تیس درہم قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ جناب
کی طرف سے حضرت سیدۂ عالم کی روحانی عظمت کے لحاظ سے مہر میں خدا کی خدائی
کا بہت بڑا حصہ تھا مگر سیدہ کے مہر کو ظاہری حیثیت سے بہت کم رکھ کر ہمیشہ کے لیے
مسلمانوں کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کا سامان کیا گیا کہ وہ مہر کی رقم کے خواہ مخواہ
زیادہ ہونے کو معیار عزت نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ مہر کا کم ہونا سیدۂ عالم کی پیروی
ہونے کے لحاظ سے بہت بڑی عزت کا سرمایہ ہے۔ آخر کو اسلامی تاریخ میں ایک مثالی
تقریب کے طور پر یہ شادی مکمل ہوگئی۔ اور اگر مسلمان اس شادی کی کیفیت کو پیش نظر

رکھیں تو کبھی بیجا رسوم سے اپنی بربادی کی صورتیں اختیار کرنے میں عزت محسوس نہ کریں

اولاد شادی ہونے کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ صرف نو برس زندہ رہیں اس نو برس میں آپ کے یہاں شادی کے دوسرے ہی سال حضرت امام حسنؑ پیدا ہوئے تیسرے سال حضرت امام حسینؑ پھر غالباً پانچویں سال حضرت زینبؑ اور ساتویں سال حضرت امّ کلثومؑ، نویں سال محسنؑ بطن میں تھے جب کہ وفاتِ رسولؐ ہوئی اور وہ ناگوار حادثے پیش آئے جن کے سبب سے اسقاط ہو گیا اور پھر حضرت سیدہ بھی جانبر نہ ہو سکیں۔ وفات کے وقت دو صاحبزادے حسنؑ اور حسینؑ موجود تھے جو امام خلقؑ ہوئے اور دو صاحبزادیاں زینبؑ امّ کلثومؑ تھیں جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے طبقۂ خواتین میں اپنی ماں کی سچی جانشین ثابت ہوئیں۔

اخلاق و اوصاف سیدۂ عالمؑ شکل و شمائل گفتار و رفتار اور حسن بیان میں ہر بات میں رسولؐ سے انتہائی مشابہ اور خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانت داری میں اپنے والد بزرگوار کی مکمل تصویر تھیں۔ آپ نے اپنی مختصر زندگی میں نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بلند سیرت کے وہ نمایاں نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس طبقہ کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

خانہ داری فاطمہ زہراؑ نے شادی کے بعد سے تمام گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا شروع کیا۔ جھاڑو دینا، کھانا پکانا، چرخہ چلانا، چکی پیسنا اور بچوں کی تربیت کرنا یہ سب کام اور ایک اکیلی سیدہ! لیکن کبھی نہ تیوریوں پر بل آئے نہ اپنے شوہر حضرت علی ابن ابی طالب سے کبھی اپنے لیے کسی مددگار یا خادمہ کے انتظام کی فرمائش کی۔ ایک مرتبہ اپنے پدر بزرگوار حضرت رسول خداؐ سے ایک کنیز عطا کرنے کی خواہش کی تو رسولؐ نے بجائے کنیز عطا فرمانے کے وہ تسبیح تعلیم فرمائی جو تسبیح فاطمہ زہراؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمد للہ

اور ۳۴ مرتبہ سبحان اللہ۔ حضرت فاطمہ اس تسبیح کی تعلیم سے اتنی خوش ہوئیں کہ کنیز کی خواہش
ترک کر دی۔ بعد میں رسولؐ نے ایک کنیز عطا فرمائی جو فضہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سیدہ
فضہ کے ساتھ ایک کنیز کا سا نہیں بلکہ برابر سے ایک خدمت گزار رفیق کار کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔
اسلام کی تعلیم یقیناً یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کے جہاد میں مشترک طور پر حصہ لیں
اور کام کریں، بیکار نہ بیٹھیں مگر ان دونوں میں صنف کے اختلاف کے لحاظ سے تقسیم عمل ہے۔
اس تقسیم کار کو علیؑ اور فاطمہؑ نے مکمل طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ گھر سے باہر کے تمام
کام آپ کیا کرتے۔ باغوں میں پانی دیتا اور اپنی قوت بازو سے اپنے اور اپنے گھر والوں
کی بسر زندگی کا سامان کرنا یہ علیؑ کے ذمے تھے اور گھر کے اندر کے تمام کام حضرت فاطمہ زہرا
انجام دیتی تھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آج چودہ سو برس کے بعد بھی کاموں کی شکل وہی
رہے جو پہلے تھی بلکہ زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اُن میں فرق ہو سکتا ہے مگر اس روح کو
جو گھر کے اندر اور باہر کی زندگی کے تفرقہ کے ساتھ قائم ہے محفوظ رکھا جانا ہر حال میں
ضروری ہے۔

تزک و احتشام اور آرائش سے علیحدگی عام طور سے خواتین کی طبیعت آسائش
زیب و زینت کی طرف خاص رغبت رکھتی ہے۔ اس کے سبب سے اکثر مردوں کو پریشانی اٹھانا
پڑتی ہے اور بسا اوقات آمد و خرچ کے توازن میں فرق کی ذمہ دار بھی آرائش پسندی
ہوتی ہے جس سے اقتصادی تباہی آتی ہے۔ سیدہ عالم نے ہمیشہ اپنی زندگی کو مسلمانوں کے
غریب گھرانوں کی عورتوں کے لیے ایک بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی لباس
و زیور یا سامانِ خانہ داری میں تصنع اور تجمل کو پسند نہیں کیا۔ اور خود رسولؐ کی تعلیم بھی

یہی رہی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدہ عالم نے اگر اپنے لیے دو چاندی کے
کنگن بنگوا لیے تھے اور دو گوشوارے اور دروازہ کا نیا پردہ تیار کرا لیا تھا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وآلہ تشریف لائے تو آپ کی صرف ایک معنی خیز خاموشی سے سیدہ کو بخوبی معلوم
ہوا کہ انہیں راہ خدا میں خیرات کر دیا

رسالتمآب کو یہ معلوم ہوا تو اتنا خوش ہوئے کہ تین مرتبہ فرمایا۔ "وہی
کیا جو میں چاہتا تھا۔ اُس کا باپ اُس پر فدا ہو جائے" اس عالم انسانیت عظیم ترین
ہستی کی یہ بلند مرتبہ بیٹی ہی صرف وہ تھی جو اُس کے بلند اخلاقی معیار تعلیم کو عمل کی
مجسم شکل میں اُس نقطہ پر لا سکے جو اُس کا معراج بلندی ہے۔

عبادت و دعا کے موقع پر ایثار فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عبادت وہ تھی
جو عالم انسانیت کے اس طبقہ کے لیے جاودانی مثال ہے۔ عبادت بظاہر مخلوق اور
خالق کے درمیان کی انفرادی چیز ہے اس لیے زیادہ تر عبادت کرنے والے ایسے ہوں گے
جو شاید اپنے مال یا غذا میں بھی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کر سکتے ہوں مگر ادائیگی
بارگاہ میں تو "خودغرضی" ہی نظر آتی ہے لیکن آل رسول اس سے مستثنیٰ ہیں وہ خالق کی
بارگاہ میں بھی کھڑے ہوتے تھے تو دوسرے مخلوق کا درد اپنے دل میں لیے ہوئے چنانچہ
حضرت سیدہ عالم کے متعلق شاہزادہ امام حسن کا بیان ہے کہ سیدہ عالم نے رات بھر محراب
عبادت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور مومنین و مومنات کے لیے بہت دعا کی مگر اپنے لیے
کوئی دعا نہ مانگی۔ اس کا سبب شاہزادہ نے آپ سے ذکر کیا تو فرمایا الجار ثم
الدار یہ عربی کی کہاوت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پڑوسی کا خیال گھر کی دیکھ بھال

سے مقدم ہے

پردہ سیدۂ عالم نہ صرف اپنی سیرتِ زندگی بلکہ اقوال سے بھی خواتین کے لیے پردہ کی اہمیت پر بہت زور دیتی تھیں۔ آپ کا مکان مسجدِ رسول سے بالکل متصل تھا لیکن آپ نقاب و چادر میں نہاں ہو کر کبھی اپنے والدِ بزرگوار کے پیچھے نمازِ جماعت میں شرکت یا آپ کے موعظہ کے سننے کے لیے مسجد میں تشریف نہیں لائیں بلکہ اپنے فرزند امام حسنؑ سے جب وہ مسجد سے واپس جاتے تھے اکثر رسولؐ کے خطبہ کے مضامین سُن لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے منبر پر یہ سوال پیش کر دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ یہ بات سیدہ تک پہنچی تو آپ نے جواب دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ نہ اس کی نظر کسی غیر مرد پر پڑے اور نہ کسی غیر مرد کی نظر اس پر پڑے۔ رسولؐ کے سامنے یہ جواب پیش ہوا تو حضرت نے فرمایا "کیوں نہ ہو۔ فاطمہؑ میرا ہی ایک جزو ہے"۔

خدمتِ اسلام اسلامی تعلیم میں عورت کے جہاد کی نوعیت ہی مرد کے جہاد سے الگ رکھی گئی ہے اس لیے حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اسی کی پابند تھیں اس لیے کسی جہاد میں سیدۂ عالم کا میدانِ جنگ میں قدم رکھنا ثابت نہیں ہوتا لیکن جس حد تک اُن کے حدود عمل تھے اُن میں ان جہادوں کے ذیل میں بھی غیر متعلق نہ تھیں مثلاً جنگِ اُحد میں جب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ مدینہ واپس آئے اس حالت میں کہ چہرۂ خون سے رنگین تھا تو "سیدۂ عالم" ہی تھیں جو ظرف میں پانی لے کر حاضر ہوئیں اور رسول کا چہرہ دھلوایا۔ علی بن ابی طالبؑ آئے اس شان سے کہ شانوں تک دونوں ہاتھ دشمنوں کے خون سے رنگین تھے اور تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔ آپ نے تلوار فاطمہ زہراؑ کی طرف بڑھائی اور عجیب فخر کے انداز میں کہا کہ

ــــ ۵ ارشاد شیخ مفید

لو یہ تلوار آج اس نے میرے ساتھ وفاداری کی حد کر دی، رسول نے بھی ارشاد کیا کہ لو فاطمہؑ علیؑ کے ہاتھ سے تلوار کو لو۔ آج تمھارے شوہر نے جو اُن کا فرض تھا وہ بڑے نازک مرحلہ پر ادا کیا اور اللہ نے انھی کی تلوار سے قریش کے بڑے بڑے آدمیوں کا خاتمہ کرایا۔"

فاطمہ زہراؑ نے خاموشی کے ساتھ ان باتوں کو سُنا اور تلوار ہاتھ میں لی اور یقیناً اُن باتوں سے اُنھوں نے خود بھی ایک طرح کا فخر محسوس کیا جس کے ساتھ اُنھیں ایسی عظیم منزل جہاد میں بذاتِ خود شریک نہ ہونے کا کوئی افسوس کبھی نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اُن کا جہاد یہی ہے جسے وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رہ کے اُسی طرح پورے طور پر ہمیشہ ادا کیا کرتی ہیں جس طرح علیؑ نے ان جنگوں میں جہاد کا فرض ادا کیا۔ ہاں صرف ایک موقع عیسائیوں کے مقابلہ میں پُر امن روحانی جہاد یعنی مباہلہ کا ایسا تھا جہاں سیدۂ عالم خدا کے حکم سے برقع و چادر میں نہاں ہو کر اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکلیں جس کا واقعہ یہ تھا کہ یمن سے عیسائیوں کے علماء کا ایک وفد رسول کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے آیا اور کئی دن اُن سے بحث ہوتی رہی جس سے حقیقت اُن پر روشن تو ہو گئی مگر سخن پروری کی بنا پر وہ قائل نہ ہوتا تھے نہ ہوئے اس وقت قرآن کی آیت اُتری کہ اے رسولؐ اتنے سچے دلائل کے بعد بھی یہ نہیں مانتے تو ان سے کہو کہ پھر آجاؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو اور اللہ کی طرف رُجوع کریں اور جھوٹوں کے لیے اللہ کی لعنت یعنی عذاب کی بد دعا کریں" عیسائی علماء پہلے تو اس کے لیے تیار ہو گئے مگر جب رسول اللہ تشریف لے گئے اس شان سے کہ حسنؑ اور حسینؑ ایسے بیٹے، فاطمہ زہراؑ ایسی خاتون اور علیؑ ایسے نفس

کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھے تو عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور مخصوص شرائط پر صلح کر کے واپس گئے اس طرح فاطمہ زہراؑ نے ثابت کر دیا کہ اُن کا معیار پردہ بھی جس کی وہ پابند ہیں بربنائے عادت نہیں بلکہ بربنائے فرض ہے اس لیے کسی مستثنیٰ صورت میں اسلام کا حکم ظاہری صورت میں اُن کے عام دستور زندگی کے خلاف فریضہ عائد کرے تو اُس کی تعمیل بھی اُن کے لیے ویسی ہی خوشگوار ہے جیسی اپنے عام دستور کی پابندی۔

رسولؐ کا برتاؤ حضرت فاطمہ زہراؑ کے اوصاف و کمالات ہی کا نتیجہ تھا کہ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ محبت بھی انتہائی فرماتے تھے اور آپ کی عزت بھی کرتے تھے جو اپنی بیٹی کی عزت کوئی دوسرا باپ نہیں کیا کرتا۔

محبت کے مظاہروں میں سے ایک یہ تھا کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر میں فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہوتے تشریف لاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے فاطمہ زہرا کے دیکھنے کو تشریف لاتے تھے

اور عزت و احترام کا مظاہرہ یہ ہے کہ جب فاطمہؑ آتی تھیں تو آپ تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنی جگہ پر لا کر بٹھاتے تھے۔ یہ برتاؤ رسولؐ کا فاطمہ زہراؑ کے سوا کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہ تھا۔

فضائل سیدہ عالم کی فضیلت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اتنی حدیثیں وارد ہیں جتنی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے سوا کسی دوسری شخصیت کے لیے نہیں ملتیں۔

ان میں سے اکثر علمائے اسلام میں متفقہ حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً آپ "بہشت میں جانے والی خواتین کی سردار ہیں" "دنیا بنانے والی عورتوں کی سردار ہیں" "تمام جہان کی عورتوں کی سردار ہیں" "آپ کی رضا

سے اللہ راضی ہوتا ہے اور آپ کی ناراضگی سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔" "جس نے آپ کو ایذا
دی اُس نے رسولؐ کو ایذا دی" آپ کا نام فاطمہؑ اس لیے ہوا ہے کہ خدا نے آپ کی بدولت آپ
کے دوستوں کو عذابِ جہنم سے چھڑا دیا ہے۔" "فطم" کے معنی چھڑانے کے ہیں۔ فاطمہؑ کے معنی
ہوئے "چھڑانے والی" اس طرح کی بکثرت حدیثیں ہیں جو معتبر کتابوں میں درج ہیں۔

وفاتِ رسولؐ بعثت کے ۲۳ برس اور ہجرت کے دس برس بعد جب فاطمہ زہراؑ ۱۸ برس کی
تھیں آپ کے چاہنے والے اور آپ کی عزت کرنے والے قدردان باپ نے دنیا سے رحلت فرمائی
اس صدمہ کا اثر فاطمہ زہراؑ نے اتنا لیا جتنا کسی بیٹی نے کبھی اپنے باپ کی وفات کا اثر نہیں لیا ہوگا

نوحہ و بکا رسولؐ کی وفات کے بعد سیدۂ عالم جتنے دن زندہ رہیں کبھی کسی نے آپ کو ہنستے یا مسکراتے
نہیں دیکھا بلکہ برابر باپ کے غم میں روتی رہیں اور آپ اتنے پُردرد طریقہ پر نوحہ کرتی تھیں کہ آس پاس کے رہنے
والے بھی شدید طور پر متاثر ہوتے تھے۔

ناگوار حالات افسوس ہے کہ وہ فاطمہؑ جن کی تعظیم کو رسولؐ کھڑے ہو جاتے تھے بعد رسول اہلِ زمانہ
کا رخ ہر طرف سے پھرا ہوا محسوس کرتی تھیں۔ علی ابن ابی طالبؑ سے خلافت کا حق لیا جا چکا تھا ہی بیٹھ
نہ رہنے دیا گیا کہ آپ سے بیعت کا سوال بھی کیا جانے لگا اور صرف سوال ہی نہیں بلکہ جبر و تشدد کو
بھی کام میں لایا جانے لگا۔ انتہا یہ کہ سیدۂ عالم کے گھر پر لکڑیاں جمع کر دی گئیں اور آگ لگائی جانے لگی
اس وقت کے صدمۂ ذہنی کی شدت تھی جسے جسمانی حیثیت سے سیدہ برداشت نہ کر سکیں اور یہی
آپ کی وفات کا سبب ہوا۔ ان صدموں کی شدت سیدہ کی زبان پر جاری ہونے والے اس شعر سے ظاہر
ہے کہ صُبّت علیّ مصائب لو انّہا + صُبّت علی الایام صرن لیالیا "یعنی مجھ پر
وہ مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ راتیں ہو جاتے۔"

بہ اہتمام

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۱۲

امامیہ مشن لکھنؤ

از

جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

(مجتہد العصر)

قیمت ۲ر

محصول ؎ر

تعارف

رسالہ "رہبر کامل" کا تیسرا اڈیشن جو آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اگرچہ بہت مختصر ہے مگر جناب سید العلماء مدظلہ نے اس مختصر رسالے میں حضرت علی کی زندگی کا ایک مکمل خاکہ کھینچ دیا ہے۔ مہد سے لحد تک کے ضروری واقعات جس سے آپ کی سیرت کے متعلق ایک اندازہ کیا جا سکے اس میں موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا تمام مصائب سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے اگر وہ اس رہبر کامل کی زندگی سے ذرا سا بھی سبق حاصل کر لے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا ابھی تک اس سے بہت حد تک بے خبر ہے۔ یہ رسالہ اسی مقصد سے شائع کیا جا رہا ہے کہ ناواقف افراد اور جماعتوں کو اس "انسان کامل" کی زندگی کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا جائے۔ انسانی درد رکھنے والوں سے امید ہے کہ وہ اس رسالہ کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے کر اس مقصد میں ہماری مدد کریں۔

خادم مشن
سید محمد رضا نقوی نصیرآبادی
آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان ایک سچے راستہ بتانے والے کی تلاش میں ہر وقت لگا ہوا ہے۔ یہ
پیاس اس کو ہر چمکتے ہوئے بالو کے تختے کی طرف دوڑاتی ہے وہ پانی سمجھ کر لپک جاتا
ہے مگر بعد میں دھوکا ہوتا ہے ضرورت ہے ایک ایسے بے خطا انسان کی جس کی
ساری زندگی میں کتنی ہی گہری نگاہ سے چھان بین کی جائے اس کی بلندی میں کوئی
کمی کیسی ترقی ہی پیدا ہوتی چلی جائے پھر یہ کہ وہ انسانوں کے کسی ایک گروہ یا کسی
ایک جگہ کے رہنے والوں ہی کے لیے مثال نہ ہو بلکہ دنیا کا ہر آدمی اس کی زندگی
کو اپنے لیے نمونہ سمجھے عام طور پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے
تو محدود نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نوشیرواں عادل ایک انصاف پرور بادشاہ
کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے مگر وہ سلاطین ہی کے لیے نمونہ ہے۔ رعایا کو
کس طرح مل جل کر صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ یہ سبق نوشیرواں کی سیرت
سے حاصل نہیں ہو سکتا، حاتم کا نام سخاوت میں مشہور رہے مگر وقت آنے پر قوم
اور ملت کے لیے لڑائی کس طرح لڑی جا سکتی ہے اسے حاتم کی زندگی میں تلاش
کرنا بے کار ہے۔ بڑے بڑے بہادروں کا نام دلاوری میں سامنے آتا ہے مگر
وقت پڑنے پر مظالم کس طرح سہے جا سکتے ہیں، ان کی زندگی اس کو نہیں بتا سکتی،
یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ہر صفت کی مثال کے لیے ایک ایک آدمی کا نام پیش کر دیا
جائے مگر ان کا مجموعہ کبھی یہ نہ بتا سکے گا کہ ان صفتوں کا ایک ساتھ استعمال کیونکر
ہو سکتا ہے اور ان کا میل جول اس طریقے پر کہ پورے طور سے ہر ایک کی
مناسب حد اور موقع استعمال معلوم ہو سکے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کے لیے تو ایک

ایسا ہی راہ نما و رہ کار ہے جو ایک اکیلا ان تمام انسانی اوصاف کا مجموعہ ہو جس نے زندگی کی ہر منزل میں قدم رکھا ہو اور ہر راستے میں اپنے قدم کے نشان چھوڑے ہوں۔ تاریخ عالم میں ڈھونڈھنے پر ایسی ہستی اگر ہمیں نظر آتی ہے تو وہ صرف علی ابن ابی طالبؑ کی ذات ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا آپ کی زندگی کے ہر ہر رُخ سے واقف ہو اور اس میں اپنی راہنمائی کے پہلو تلاش کرے اسی نقطۂ نظر سے یہ مختصر رسالہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ چند صفحے اس اتھاہ سمندر کے ایک قطرے کے برابر بھی نہیں ہیں، مگر اسے ایک خاکہ سمجھنا چاہیے جس کے انداز پر ایک بڑی سے بڑی کتاب بھی تیار کی جا سکتی ہے۔

نسب حضرت علیؑ آل ابراہیمؑ میں قریش کی نسل سے بنی ہاشم کے ممتاز گھرانے میں عبدالمطلب کے فرزند ابوطالبؑ کے چشم و چراغ تھے آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بھی ہاشم کے خاندان کی معزز خاتون تھیں۔ صرف ایک واسطے سے آپ کا نسب حضرت پیغمبر خدا محمدؐ مصطفےٰ سے مل جاتا ہے۔ وہ محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب اور یہ علی ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب آپ کے والد ابوطالب ہی نے رسول اللہ کی پرورش بھی کی تھی۔

ولادت پیغمبر خدا کی عمر تیس۳۰ برس کی تھی جب خانہ کعبہ سے مقدس مقام پر ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل میں علیؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد ابوطالب اور ماں فاطمہ بنت اسد کو جو خوشی ہونا چاہیے تھی وہ تو ہوئی ہی مگر سب سے زیادہ رسولؐ اللہ اس بچے کو دیکھ کر خوش ہوئے شاید بچے کے خط و خال سے اسی وقت یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ آئندہ چل کر رسول کا قوت بازو اور دست

محمدؐ مصطفےٰ کے ذمہ ہوئی آپ نے انتہائی محبت اور توجہ سے اپنا پورا وقت اس چھوٹے بھائی کی علمی اور اخلاقی تربیت میں صرف کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ علی دس برس کے سن میں ایسے تھے کہ پیغمبرؐ کے دعوائے رسالت کرنے پر ان کے سب سے پہلے پیرو بلکہ ان کے دعوے کے گواہ قرار پائیں۔

بعثت علیؑ کا دس برس کا سن تھا جب حضرت محمدؐ مصطفےٰ اعلیٰ طور پر پیغام آلٰہی کے پہنچانے پر مامور ہوئے اسی کو بعثت کہتے ہیں۔

زمانہ، ماحول، شہر، اپنی قوم اور خاندان سب کے خلاف ایک ایسی مہم شروع کی جا رہی تھی جس میں رسولؐ کا ساتھ دینے والا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا سوائے اسی دس برس کے بچے کے جسے پیغمبر نے اسی دن کے لیے پہلے سے تیار کیا تھا پیغمبرؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا اور علیؑ نے سب سے پہلے اس کی تصدیقؑ کی اور ایمان اختیار کیا۔

دورِ ابتلا پیغمبرؐ کا دعوائے رسالت کرنا تھا کہ ہر ہر ذرہ رسولؐ کا دشمن نظر آنے لگا وہی لوگ جو کل تک آپ کی سچائی اور امانت داری کا دم بھرتے رہے تھے۔ آج آپ کو جھوٹا، دیوانہ، جادوگر۔ اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگے راستوں میں کانٹے بچھائے جانے۔ پتھر مارے جاتے اور سر پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اس سخت وقت میں رسولؐ کا ہر مصیبت میں شریک صرف ایک بچہ تھا۔ وہی علیؑ جس نے بھائی کا ساتھ دینے میں کبھی ہمت نہیں ہاری، برابر محبت و وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ ہر ہر بات میں رسولؐ کے سینہ سپر رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب مخالف گروہ نے انتہائی سختی کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ پیغمبرؐ کا اور ان کے تمام گھرانے والوں کا بائیکاٹ کیا جائے حالات اتنے خراب تھے کہ جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابو طالب نے تمام اپنے ساتھیوں کو حضرت محمدؐ مصطفےٰ سمیت ایک پہاڑ کے دامن میں محفوظ قلعہ میں بند کر دیا۔ تین برس تک اس قید و بند کی زندگی بسر کرنا پڑی اس میں ہر شب یہ اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن شب خون نہ مارے اس لیے

ابوطالبؑ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ رات بھر رسولؐ کو ایک بستر پہ نہیں رہنے
دیتے تھے، بلکہ کبھی جعفرؑ کو رسولؐ کے بستر پہ اور رسولؐ کو جعفر کے بستر پہ لٹا دیتے
تھے کبھی عقیل کو اور اسی طرح کبھی علیؑ کو رسولؐ کے بستر پہ لٹاتے تھے اور رسولؐ کو
علیؑ کے بستر پر، مطلب یہ تھا کہ اگر دشمن رسولؐ کے بستر کا پتہ لگا کر حملہ کرنا چاہے
تو میرا جو بھی بیٹا چاہے قتل ہو جائے مگر رسولؐ کا بال بیکا نہ ہو۔ اس طرح علیؑ بچپنے
ہی سے فداکاری اور جاں نثاری کے سبق کو عملی طور پہ دہراتے رہے۔

ہجرت

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ابوطالب کی وفات ہو گئی اور اس جاں
نثار چچا کی وفات سے پیغمبرؐ کا دل ٹوٹ گیا اور آپ کے مخالفوں کی ہمت
بڑھ گئی۔ آخر ان سب نے ایکا کیا کہ ایک رات جمع ہو کر پیغمبرؐ کے گھر کو گھیر لیں اور
حضرت کو شہید کر ڈالیں۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے اسی جاں
نثار بھائی علیؑ کو بلا کر اس واقعہ سے اطلاع دی اور فرمایا کہ میری جان کی رکھوالی
یوں ہو سکتی ہے کہ تم آج کی رات میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو اور
میں چھپ کر مکّہ سے روانہ ہو جاؤں، کوئی دوسرا ہوتا تو یہ پیغام سنتے ہی اس کا دل
ہل جاتا مگر علیؑ نے یہ سن کر کہ میرے ذریعہ سے رسولؐ کی جان کی حفاظت ہو گی خدا
کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہوئے کہ مجھے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہی
ہوا کہ رسالت مآبؐ شب کے وقت مکّہ معظمہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور
علیؑ ابن ابی طالب رسولؐ کے بستر پر سو گئے۔ چاروں طرف خون کے پیاسے
دشمن تلواریں کھینچے نیزے لیے ہوئے مکان کو گھیرے ہوئے تھے۔ بس اس بات
کی دیر تھی کہ ذرا صبح ہو اور سب کے سب گھر میں گھس کر رسالت مآبؐ کو شہید کر ڈالیں
علیؑ اطمینان کے ساتھ بستر پہ آرام کرتے رہے اور ذرا بھی اپنی جان کا خیال نہ کیا
دشمنوں کو صبح کے وقت یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ نہ تھے، علیؑ تھے، انھوں نے آپ پہ

دباؤ ڈالنا چاہا کہ آپ بتلا دیں کہ رسولؐ کہاں گئے ہیں مگر علیؑ نے بڑے بہادرانہ تیوروں سے یہ بتلانے سے قطعی انکار کر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت رسول اللہؐ مکہ سے کافی دور تک بغیر کسی گھبراہٹ اور رکاوٹ کے تشریف لے جا سکے علیؑ تین روز تک مکہ میں رہے جن جن کی امانتیں رسول اللہؐ کے پاس تھیں ان تک ان کی امانتوں کو پہنچا کر رسولؐ کے گھر کی عورتوں کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے کئی روز تک آپ رات دن پیدل چل کر اس طرح کہ پیروں سے تمام خون بہہ رہا تھا۔ مدینہ میں رسول کے پاس پہنچے اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ پر رسول کو سب سے زیادہ اعتماد تھا جس وفاداری ہمت اور دلیری سے علیؑ نے اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔

شادی

رسولؐ نے مدینے میں آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہرؑا کا عقد علیؑ کے ساتھ کر دیا۔ رسولؐ اپنی بیٹی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے اور عزت اتنی کرتے تھے کہ جب فاطمہ زہرؑا آتی تھیں تو رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہر شخص اس بات کا طلبگار تھا کہ رسولؐ کی اس معزز بیٹی کے ساتھ منسوب ہونے کا شرف اسے حاصل ہو۔ دو ایک نے ہمت بھی کی کہ وہ رسولؐ کو پیغام دیں مگر حضرت نے سب کی خواہشوں کو رد کر دیا اور یہ کہا کہ فاطمہؑ کی شادی بغیر حکم خدا کے نہیں ہو سکتی۔ ہجرت کا پہلا سال تھا جب رسولؐ نے علیؑ کو اس عزت کے لیے منتخب کیا یہ شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام دی گئی۔ شہنشاہ دین و دنیا حضرت پیغمبرؐ خدا کی بیٹی اور اس کو پیغمبر کی طرف سے جہیز بھی نہیں دیا گیا خود فاطمہؑ کا مہر تھا جو علیؑ سے لے کر کچھ سامان خانہ داری فاطمہؑ کے لیے خرید کر ساتھ کر دیا گیا، وہ بھی کیا؟ مٹی کے کچھ برتن، خرمے کی چھال کے تکیے، چمڑے کا بستر اور چرخہ، چکی اور پانی بھرنے کی مشک، اس طرح کا سامان دیا گیا، علیؑ نے مہر

ادا کرنے کے لیے اپنی زرہ فروخت کی اور اس سے فاطمہ زہرا کا مہر ادا کیا جو ایک سو سات روپیہ کی تعداد سے زیادہ نہ تھا اس طرح مسلمانوں کے واسطے ہمیشہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی گئی کہ وہ اپنے تقریبات کے سلسلہ میں فضول خرچی سے کام نہ لیں۔

خانہ داری

فاطمہؑ اور علیؑ کی زندگی گھریلو زندگی کا ایک بے مثال نمونہ تھی، مرد اور عورت آپس میں کس طرح ایک دوسرے کے شریک حیات ثابت ہو سکتے ہیں، آپس میں کس طرح تقسیم عمل ہونا چاہیئے اور کیونکر دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے لیے مددگار ہو سکتی ہے وہ گھر دنیا کی آرائشوں سے دور، راحت طلبی اور تن آسانی سے بالکل علیحدہ تھا محنت اور مشقت کے ساتھ ساتھ دلی اطمینان اور آپس کی محبت و اعتماد کے لحاظ سے ایک جنت بنا ہوا تھا جہاں سے علیؑ صبح کو مشکیزہ لے کر جاتے تھے اور یہودیوں کے باغ میں پانی دیتے تھے اور جو کچھ مزدوری ملتی تھی اسے لے کر گھر پر آتے تھے بازار سے جو خرید کر فاطمہؑ کو دیتے تھے اور فاطمہؑ چکی پیستی۔ کھانا پکاتی اور گھر میں جھاڑو دیتی تھیں۔ فرصت کے اوقات میں چرخہ چلاتی تھیں اور خود اپنے اور اپنے گھر والوں کے لباس کے لیے اور کبھی مزدوری کے طور پر سوت کاتتی تھیں اور اس طرح گھر میں رہ کر زندگی کی مہم میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

جہاد

مکہ میں آکر پیغمبرؐ کو مخالف گروہ نے آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ آپ کے وہ پیرو جو مکہ میں تھے انھیں طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ بعض کو قتل کیا، بعض کو قید کیا اور بعض کو زد و کوب کیا اور تکلیفیں پہنچائیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلحہ اور فوج جمع کر کے خود رسولؐ کے خلاف مدینہ پر چڑھائی کر دی اس موقع پر رسولؐ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ مدینہ والوں کے گھروں کی حفاظت کرتے جنھوں نے کہ آپ کو انتہائی ناگوار حالات میں پناہ دی تھی۔ اور آپ کی نصرت و امداد کا

وعدہ کیا تھا آپ نے یہ کسی طرح پسند نہ کیا کہ آپ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کریں اور دشمن کو یہ موقع دیں کہ وہ مدینہ کی پُرامن آبادی کو اور عورتوں اور بچوں کو بھی پریشا[ن] کر سکے گو آپ کے ساتھ تعداد بہت کم تھی صرف تین سو تیرہ آدمی تھے ہتھیار بھی نہ تھے مگر آپ نے یہ طے کر لیا کہ آپ باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ پہلی لڑائی اسلام کی ہوئی جو جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے اس لڑائی میں رسولؐ نے زیادہ اپنے عزیزوں کو خطرے میں ڈالا، چنانچہ آپ کے چچازاد بھائی عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب اس جنگ میں شہید ہوئے۔ علی ابن ابی طالب کو جنگ کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ۲۵ برس کی عمر تھی، مگر جنگ کی فتح کا سہرا علیؑ کے سر رہا جتنے مشرکین قتل ہوئے تھے ان میں سے آدھے صرف علیؑ کے ہاتھ کے مقتول تھے اور آدھے تمام مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اس کے بعد اُحد، خندق، خیبر اور آخر میں حنین، یہ وہ بڑی لڑائیاں ہیں جن میں علیؑ نے رسولؐ کے ساتھ رہ کر اپنی بے نظیر بہادری کے جوہر دکھلائے۔ تقریباً ان تمام لڑائیوں میں علیؑ کو علمداری کا عہدہ بھی حاصل رہا۔ اس کے علاوہ بہت سی لڑائیاں ایسی تھیں جن میں رسولؐ نے علیؑ کو تنہا بھیجا، اور انھوں نے اکیلے فتح بھی حاصل کی۔ ان تمام لڑائیوں میں حضرت علیؑ نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی دکھائی اور انتہائی استقلال، تحمل اور شرافت سے کام لیا۔ جس کا اقرار خود ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔ خندق کی لڑائی میں دشمن کے سب سے بڑے سپاہی عمر ابن عبدود کو جب آپ نے مغلوب کر لیا اور اس کا سر کاٹنے کے لیے اس کے سینے پر بیٹھے تو اس نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا۔ آپ کو غصہ آگیا اور آپ اس کے سینے پر سے اتر آئے۔ صرف اس خیال سے کہ اگر غصے میں اس کو قتل کیا تو یہ فعل محض خدا کی راہ پر نہ ہوگا بلکہ اپنی خواہش نفس کے مطابق ہوگا کچھ دیر کے بعد آپ نے اس کو قتل کیا۔ اس زمانے میں دشمن کو ذلیل کرنے کے لیے اس کی لاش کو برہنہ کر دیتے تھے، مگر حضرت علیؑ نے اس کی زرہ نہیں اتاری اگرچہ

وہ بہت قیمتی تھی۔ چنانچہ اس کی بہن جب اپنے بھائی کی لاش پر آئی تو اس نے کہا کہ کسی
اور نے میرے بھائی کو قتل کیا ہوتا تو میں عمر بھر روتی، مگر مجھے یہ دیکھ کر صبر آگیا
کہ اس کا قاتل علیؑ کا سا شریف انسان ہے جس نے اپنے دشمن کی لاش کی توہین گوارا
نہیں کی، آپ نے کبھی دشمن کی عورتوں یا بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کبھی مال غنیمت
کی طرف رخ نہیں کیا۔

خدمات

علاوہ جہاد کے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے لیے کسی کام کے کرنے میں
آپ کو انکار نہ تھا۔ یہ کام مختلف طرح کے تھے رسولؐ کی طرف سے
عہدناموں کا لکھنا خطوط تحریر کرنا آپ کے ذمہ تھا۔ قرآن کی آیتیں جو اترتی تھیں
ان کا لکھنا بھی اکثر آپ کے ذمہ ہوتا تھا اور لکھے ہوئے اجزائے قرآن کے امانت
دار بھی آپ تھے۔ اس کے علاوہ یمن کی جانب تبلیغ اسلام کے لیے پیغمبرؐ نے آپ کو
روانہ کیا جس میں آپ کی کامیاب تبلیغ کا اثر یہ تھا کہ سارا یمن مسلمان ہو گیا۔ جب
سورۂ برائت نازل ہوا تو اس کی تبلیغ کے لیے بحکم خدا آپ ہی مقرر ہوئے اور آپ
نے جا کر مشرکین کو سورۂ برائت کی آیتیں سنائیں۔ اس کے علاوہ رسالت مآبؐ
کی ہر خدمت انجام دینے پر تیار رہتے تھے یہاں تک کہ یہ بھی دیکھا گیا کہ رسول
کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سی رہے ہیں، علیؑ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے

اعزاز

حضرت علیؑ کی خدمتوں کی بنا پر رسولؐ ان کی بہت عزت کرتے تھے
اور اپنے قول اور فعل سے ان کی خوبیوں کو ظاہر کرتے رہتے تھے اور
کبھی یہ کہتے تھے کہ "علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں"۔ کبھی یہ کہا کہ "میں علم کا شہر
ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ کبھی یہ کہ "تم سب میں بہترین فیصلہ کرنے والا
علیؑ ہے"۔ کبھی یہ کہ "علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی"۔
کبھی یہ کہ "علیؑ مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہیں جو روح کو جسم سے یا سر کو بدن سے

ہوتا ہے" کبھی یہ کہ "وہ خدا اور رسولؐ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں" یہاں تک کہ مباہلہ
کے واقعہ میں علیؑ کو نفسِ رسولؐ کا خطاب ملا علی اعزاز یہ تھے کہ مسجد میں سب کے
دروازے بند ہوئے تو علیؑ کا دروازہ کھلا رکھا گیا جب مہاجرین و انصار میں
بھائی چارہ کیا گیا تو علیؑ کو پیغمبرؐ نے اپنا دنیا و آخرت کا بھائی قرار دیا اور سب
سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں ہزاروں مسلمانوں کے مجمع میں علیؑ کو اپنے
ہاتھوں پر بلند کر کے یہ اعلان فرما دیا کہ "جس طرح میں مسلمانوں کا سرپرست
اور حاکم ہوں اسی طرح علیؑ سب کے سرپرست اور حاکم ہیں" یہ اتنا بڑا اعزاز
تھا کہ تمام مسلمانوں نے علی کو مبارکبادیں دیں۔ اور سب نے یہ سمجھا کہ پیغمبرؐ نے
علیؑ کی ولی عہدی اور جانشینی کا اعلان کر دیا ہے۔

رسولؐ کی وفات

ہجرت کو دس برس پورے ہوئے تھے جب پیغمبرؐ خدا
اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو مرض الموت ثابت ہوئی
یہ خاندانِ رسولؐ کے لیے ایک قیامت خیز مصیبت کا وقت تھا۔ علیؑ رسولؐ کی بیماری
میں برابر پاس موجود رہتے اور تیمارداری میں مصروف رہتے تھے، اور رسولؐ
بھی علیؑ کا اپنے پاس سے ہٹنا ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ
وقت آیا جب رسولؐ عالمِ احتضار میں تھے۔ آپ نے علی کو اپنے پاس بلایا اور سینے
سے لگا کے بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے اور ضروری وصیتیں فرمائیں
اس گفتگو کے بعد بھی علیؑ کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیا اور ان کا ہاتھ اپنے سینے پر
رکھ لیا جس وقت رسولؐ کی روح جسم سے جدا ہوئی ہے اس وقت بھی علیؑ
کا ہاتھ رسول کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

بعد رسولؐ

جس نے زندگی بھر پیغمبرؐ کا ساتھ دیا وہ بعد رسولؐ آپ کی لاش
کو کس طرح چھوڑتا چنانچہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین اور غسل و کفن

علیؑ ہی کے ہاتھوں ہوا اور قبر میں بھی آپ ہی نے رسول کو اتارا۔ رسول کے دفن
سے فرصت ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں پیغمبر کی جانشینی کا انتظام
ہو گیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو جنگ آزمائی پر تیار ہو جاتا مگر علی کو
اسلامی مفاد اتنا عزیز تھا کہ آپ نے اپنے حقوق کے اعلان کے باوجود اپنی طرف
سے مسلمانوں میں خانہ جنگی پیدا نہیں ہونے دی۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے معرکہ
آرائی نہیں کی بلکہ جب وقت ضرورت پڑی اس وقت اسلامی مفاد کی خاطر آپ
نے امداد دینے سے دریغ بھی نہیں کی۔ مشکل مسائل کا فیصلہ ضروری مشورہ
لیے جانے پر اپنی مفید رائے کے اظہار سے کبھی پہلو نہیں بچایا۔ اس کے علاوہ
بہ طور خود خاموشی کے ساتھ اسلام کی روحانی اور علمی خدمت میں مصروف
رہے۔ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق ناسخ و منسوخ اور محکم اور متشابہ کی تشریح
کے ساتھ مرتب کیا۔ مسلمانوں کے علمی طبقے میں تصنیف و تالیف کا اور علمی تحقیق کا
ذوق پیدا کیا اور خود بھی تفسیر اور کلام اور فقہ و احکام کے بارے میں ایک
مفید علمی ذخیرہ فراہم کیا۔ بہت سے ایسے شاگرد تیار کیے جو مسلمانوں کی آئندہ
علمی زندگی کے لیے معماری کا کام انجام دے سکیں۔ زبانِ عربی کی حفاظت کے لیے
علم نحو کی داغ بیل ڈالی اور فن صرف اور معانی بیان کے اصول کو بھی بیان کیا
اس طرح یہ سبق دیا کہ اگر ہوائے زمانہ مخالف بھی ہو اور اقتدار نہ بھی تسلیم
کیا جائے تو انسان کو گوشہ نشینی اور کس مپرسی میں بھی اپنے فرائض کو فراموش
نہ کرنا چاہیے۔ ذاتی اعزاز اور منصب کی خاطر مفاد ملی کو نقصان نہ پہنچایا جائے
اور جہاں تک ممکن ہو انسان اپنی ملت قوم اور مذہب کی خدمت ہر حال میں
کرتا رہے۔

خلافت

پچیس ۲۵ برس تک رسول کے بعد علیؑ نے خانہ نشینی میں بسر کی
۳۵ھ میں مسلمانوں نے خلافت اسلامی کا منصب علیؑ کے

سامنے پیش کیا۔ آپ نے پہلے انکار کیا لیکن جب مسلمانوں کا اصرار حد سے
زیادہ بڑھا تو آپ نے اس شرط سے منظور کیا کہ میں بالکل قرآن
اور سنت پیغمبرؐ کے مطابق حکومت کروں گا، اور کسی رو و رعایت سے کام
نہ لوں گا مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کیا اور آپ نے خلافت
کی ذمہ داری قبول کی مگر زمانہ آپ کی خالص مذہبی سلطنت کو برداشت
نہ کر سکا۔ آپ کے خلاف بنی امیہ اور بہت سے وہ لوگ کھڑے ہو گئے
جنھیں آپ کی مذہبی حکومت میں اپنے اقتدار کے زائل ہونے کا خطرہ
تھا آپ نے ان سب سے مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھا اور جمل اور صفین
اور نہروان کی خوں ریز لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اسی
شجاعت اور بہادری سے جنگ کی جو بدر و احد خندق و خیبر میں
کسی وقت دیکھی جا چکی تھی اور زمانہ کو یاد تھی۔ ان لڑائی جھگڑوں کی
وجہ سے آپ کو موقع نہیں مل سکا کہ آپ کا جیسا دل چاہتا تھا اسی طرح
اصلاح فرمائیں پھر بھی آپ نے اس مختصر مدت میں اسلام کی سادہ
زندگی، مساوات اور نیک کمائی کے لیے محنت و مزدوری کی تعلیم کے
نقش تازہ کر دیے، آپ شہنشاہ اسلام ہونے کے باوجود کھجوروں
کی دوکان پر بیٹھنا اور اپنے ہاتھ سے کھجوریں بیچنا برا نہیں سمجھتے تھے
پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، غریبوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ
کر کھانا کھا لیتے تھے جو روپیہ بیت المال میں آتا تھا اسے تمام مستحقین
پر برابر سے تقسیم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے سگے بھائی عقیل نے
یہ چاہا کہ کچھ انھیں دوسرے مسلمانوں سے زیادہ مل جائے مگر آپ نے

تمام
مسلمانوں کا مال
ہے مجھے حق نہیں ہے
کہ میں اس میں سے کسی اپنے عزیز کو
دوسروں سے زیادہ دوں" انتہا یہ ہے کہ اگر کبھی بیت المال
میں شب کے وقت بیٹھے ہوئے
اور حساب و کتاب میں
مصروف ہوئے اور کوئی ملاقات
کے لیے آکر غیر متعلق باتیں کرنے لگا تو آپ نے
چراغ بڑھا دیا کہ بیت المال کے چراغ کو میرے
ذاتی کام میں صرف نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کی کوشش یہ
رہتی تھی کہ جو کچھ بیت المال میں آئے وہ
جلد سے جلد حق داروں تک
پہنچ جائے۔ آپ اسلامی خزانے
میں مال کا جمع رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔
شہادت
افسوس ہے کہ یہ امن، مساوات
اور اسلامی تمدن کا
علمبردار دنیا طلب لوگوں
کی عداوت

سے نہ بچا اور ۱۸ رماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کو صبح کے وقت خدا کے گھر یعنی مسجد میں عین حالت نماز میں ایک زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے زخمی کیا گیا۔ آپ کے رحم و کرم اور مساوات پسندی کی انتہا یہ تھی کہ جب آپ کے قاتل کو گرفتار کرکے آپ کے سامنے لائے اور آپ نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں تو آپ کو اس پر بھی رحم آگیا اور اپنے دونوں فرزندوں امام حسنؑ و امام حسینؑ کو ہدایت فرمائی کہ یہ تمہارا قیدی ہے اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنا جو کچھ خود کھانا وہ اسے کھلانا، اگر میں اچھا ہو گیا تو مجھے اختیار ہے میں چاہوں گا تو سزا دوں گا اور چاہوں گا تو معاف کر دوں گا اور اگر میں دنیا میں نہ رہا اور تم نے اس سے انتقام لینا چاہا تو اسے ایک ہی ضربت لگانا کیونکہ اس نے مجھے ایک ہی ضربت لگائی ہے اور ہرگز اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ قطع نہ کیے جائیں اس لئے کہ یہ تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔ دو روز تک علیؑ بستر بیماری پر انتہائی کرب اور تکلیف کے ساتھ رہے۔ آخر زہر کا اثر جسم میں پھیل گیا اور ۲۱ رماہ رمضان کو نزدہ صبح کے وقت آپ کی وفات ہوئی حسنؑ و حسینؑ نے تجہیز و تکفین کی اور پشت کوفہ پر نجف کی سرزمین میں وہ انسانیت کا تاجدار ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سونے کے واسطے دفن ہو گیا۔

——— ::: ———

پبلشر

سید محمد رضا نقوی نصیرآبادی
آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

پرنٹر

سرفراز قومی پریس
نادان محل روڈ لکھنؤ

تیسرا اڈیشن
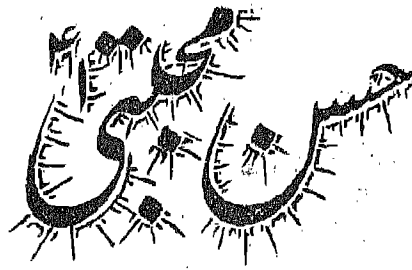
دوسرا اڈیشن

از

سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت دو آنے ۲ر   محصول ڈاک تین پیسے ر

آئمہ معصومین کی سوانح عمریوں کا جو سلسلہ مشن نے شائع کرنا شروع کیا ہے یہ رسالہ "حسن مجتبیٰ" اسی کی پانچویں کڑی ہے جس میں ہمارے اور آپ کے دوسرے امام حضرت حسن علیہ السلام کی مقدس زندگی کے حالات ہیں۔ اصولاً اس سوانح عمری کو دوسرے نمبر پر شائع ہونا چاہیے تھا مگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر یہ ترتیب شائع نہیں کی جا سکی۔

مشن کے خدمات کے ساتھ ساتھ عزیز و محترم افراد ملت کا بھی فرض مذہبی ہونا چاہیے کہ وہ ان سوانح عمریوں کو کثیر تعداد میں خرید فرما کر اپنے یہاں کی مجلسوں میں تبرک کی جگہ پر تقسیم فرمائیں۔ اس سے ایک طرف آپ کے مشن کو مزید خدمت مذہبی کا موقع ملے گا تو دوسری طرف آپ اشاعت دین کا ثواب حاصل فرمائیں گے۔ لوگوں کی معلومات دینی میں اضافے کا سبب بننا کیا کم کار ثواب ہے۔

ہم اس سلسلے میں سید العلما جناب مولانا مولوی علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ کے بے حد احسان مند ہیں کہ باوجود کثرت مشاغل جناب قبلہ نے ان سوانح عمریوں کی تصنیف و تالیف کا ذمہ فرما لیا ہے۔

خادم مشن
سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری
۸ / نومبر سنہ ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی زندگی کو اپنے راستے میں طرح طرح کے نرم اور گرم حالات
کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں اپنے فرض کا محسوس کرنا
چاہے وہ دلی خواہشوں اور طبیعت کے حوصلوں پر کتنا ہی بار ہو۔ یہی انسانیت
کی روح اور اخلاق کی جان ہے اور اس کے لیے ایسے رہناؤں کی سیرت زندگی کے
مطالعہ کی ضرورت ہے جنہیں اپنے نفس پر قابو حاصل تھا اور جو ہر موقع پر جذبات
سے نہیں بلکہ فرض کے احساس سے کام لیتے تھے اور جنھوں نے دنیا کے سامنے ضبط
وصبر وتحمل اور ایثار کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

آل محمد علیہم السلام میں یکے بعد دیگرے جو امام ہوتے رہے ان سب کی
مجموعی سیرت ایک جامع انسانیت اور اخلاق کی کتاب ہے جس میں کہیں شجاعت
کے مظاہرات ہیں کہیں حلم کے۔ کہیں سخاوت کے کارنامے ہیں کہیں ایثار کے۔
کہیں حکمت کے نمونے ہیں کہیں علم ومعرفت کے۔ چونکہ ان حضرات کو حالات
زمانہ یکساں نہیں ملے تھے بلکہ زمانے کی کج رفتاری اور انقلابی چال سے
ان کو مختلف حالات سے سابقہ پڑا۔ اور ہر حالت کے موافق ان کو بہترین طرز عمل
اختیار کرنا پڑا اس لیے نوع انسانی کی بہتری کے لیے ان میں سے ہر فرد کے حالات
زندگی کا مطالعہ لازم ہو گیا کہ بغیر اس کے مطالعہ کے انسانیت کا کوئی ایک گوشہ
تشنۂ ہدایت رہ جاتا ہے۔ اسی لیے یہ سلسلہ حالات آئمہ کا پیش کیا جا رہا
اور یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں دوسرے امام حضرت
امام حسن علیہ السلام کے حالات درج کیے جاتے ہیں

نام و نسب

حسنؑ نام، مجتبیٰ لقب اور ابو محمد کنیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معزز بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کے بطن سے حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کے بڑے فرزند تھے۔

ولادت

۱۵ ماہ رمضان المبارک کو ہجرت کے تیسرے سال آپ کی ولادت ہوئی۔ رسولؐ کے گھر میں آپ کی پیدائش اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی جب مکہ معظمہ میں رسولؐ کے بیٹے یکے بعد دیگرے دنیا سے جاتے رہے اور سوائے لڑکی کے آپ کی اولاد میں کوئی نہ رہا تو مشرکین طعنے دینے لگے اور آپ کو معاذ اللہ ابتر یعنی مقطوع النسل کہنے لگے۔ اس سے آپ کو بڑا صدمہ پہنچا اور آپ کی تسلی کے لیے قرآن مجید میں سورۂ کوثر نازل ہوا جس میں آپ کو خوشخبری دی گئی کہ خدا نے آپ کو کثرت اولاد عطا فرمائی ہے اور مقطوع النسل آپ نہیں بلکہ آپ کا دشمن ہو گا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کی مدینہ میں آنے کے تیسرے ہی سال پیدائش گویا سورۂ کوثر کی پہلی تفسیر تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ انھی امام حسنؑ اور ان کے چھوٹے بھائی امام حسین علیہ السلام کے ذریعہ سے اولاد رسولؐ کی وہ کثرت ہوئی کہ باوجود ان کوششوں کے جو دشمنوں کی طرف سے اس خاندان کے ختم کرنے کی ہمیشہ ہوتی رہیں جن میں ہزاروں کو سولی دے دی گئی۔ ہزاروں تلوار سے قتل کیے گئے اور کتنوں کو زہر دیا گیا۔ اس کے باوجود آج تک دنیا آلِ رسولؐ کی نسل سے چھلک رہی ہے۔ عالم کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا ہو گا جہاں اس خاندان کے افراد موجود نہ ہوں۔ جبکہ رسولؐ کے دشمن جن کی اس وقت کثرت سے اولاد موجود تھی ایسے فنا ہوئے کہ نام و نشان بھی ان کا کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ہے قرآن کی سچائی اور رسولؐ کی صداقت کا زندہ ثبوت جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے موجود ہے اور اس لیے امام حسن علیہ السلام کی

پیدائش سے پیغمبر کو ویسی ہی خوشی نہیں ہوئی جیسی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے
ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ کو خاص مسرت یہ ہوئی کہ آپ کی سچائی کی پہلی نشانی دنیا کے
سامنے آئی۔ ساتویں دن عقیقہ کی رسم ادا ہوئی اور پیغمبر نے بحکم خدا اپنے اس فرزند
کا نام حسنؑ رکھا۔ یہ نام اسلام کے پہلے نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ سب سے پہلے پیغمبرؐ کے اسی فرزند
کا نام قرار پایا جس طرح حسینؑ ان کے چھوٹے بھائی کا نام بھی بس انھی سے مخصوص
تھا۔ ان کے پہلے کسی کا یہ نام نہ ہوا تھا۔

تربیت

حضرت امام حسن علیہ السلام کو تقریباً آٹھ برس رہتے نانا رسول اللہؐ
کے سایۂ عاطفت میں رہنے کا موقع ملا۔ رسالت مآبؐ اپنے اس
نواسے سے جتنی محبت فرماتے تھے اس کے واقعات دیکھنے والوں نے ہمیشہ یاد رکھے۔
اکثر حدیثیں محبت اور فضیلت کی حسنؑ اور حسینؑ دونوں صاحبزادوں میں مشترک
ہیں مثلاً حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔ دونوں گوشوارۂ عرش
ہیں، یہ دونوں میرے گلدستے ہیں۔ خداوندا میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں
تو بھی ان کو محبوب رکھنا اور اس طرح کے بے شمار ارشاداتِ پیغمبر کے دونوں نواسوں
کے بارے میں کثرت سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عام قاعدہ
یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی جانب ہوتی ہے مگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے اپنے ان دونوں نواسوں کی یہ خصوصیت صراحت کے ساتھ بتائی کہ انھیں میرا
صرف نواسہ نہیں بلکہ میرا فرزند کہنا درست ہے۔

یہ حدیث حضرت کی تمام اسلامی حدیث کی کتابوں میں درج ہے کہ حضرت
نے فرمایا خدا نے ہر شخص کی اولاد کو خود اس کے صلب سے قرار دیا اور میری اولاد کو اس نے
علی ابن ابی طالبؑ کی صلب سے قرار دیا۔ پھر بھلا ان بچوں کی تربیت میں پیغمبرؐ کس قدر
اہتمام صرف کرنا ضروری سمجھتے ہوں گے جب کہ خود بچے بھی وہ تھے جنھیں قدرت نے

طہارت و عصمت کا لباس پہنا کر بھیجا تھا۔ ایک طرف آئینۂ انسانی صفات اس پر رسولؐ کے ہاتھ کی جِلا، نتیجہ یہ تھا کہ بچے کمسنی ہی میں نانا کے اخلاق و اوصاف کی تصویر بن گئے۔ خود حضرت نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حسنؑ میں میرا رعب و داب اور شانِ سرداری ہے اور حسین میں میری سخاوت اور میری جراءت ہے۔ شانِ سرداری گو مختصر لفظ ہے مگر اس میں بہت سے اوصاف کمال کی جھلک نظر آرہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں سے رسولؐ نے اپنے مشن کے کام میں ان کو اسی بچپن کے عالم میں شریک بھی کیا جس سے یہ ثابت بھی ہوا کہ پیغمبرؐ اپنے بعد حفاظت اسلام کی مہم کو اپنے ہی اہل بیت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک موقع مباہلہ کے میدان میں تھا۔ جہاں حضرت امام حسنؑ بھی اپنے نانا کے ساتھ ساتھ تھے۔

۲۸ ربیع الاول ۱۱ھ کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی اور امام حسن علیہ السلام اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہوئے۔ نانا کی وفات کے تھوڑے ہی دن کے بعد امام حسنؑ کو اپنی مادر گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اب حسنؑ کے لیے گہوارۂ تربیت اپنے مقدس باپ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی ذات تھی۔ حسنؑ اسی دور میں جوانی کی حدوں تک پہنچے اور کمال شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ پچیس برس کی خانہ نشینی کے بعد جب حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو مسلمانوں نے خلیفۂ ظاہری کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اس کے بعد جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں تو ہر ایک جہاد میں حسن علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ تھے۔ بلکہ بعض موقعوں پر جنگ میں آپ نے کارنمایاں بھی دکھلائے۔

خلافت

۲۱ رماہ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی وفات ہوئی اس وقت تمام مسلمانوں نے مل کر حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت تسلیم کی آپ پر اپنے والد

بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ سب سے پہلا خطبہ جو آپ نے ارشاد فرمایا اس میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ جناب امیرؑ کی سیرت اور مال دنیا سے پرہیز کا تذکرہ کیا۔ اس وقت آپ پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے۔ عبداللہ ابن عباس نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور لوگوں کو بیعت کی دعوت دی۔ سب نے انتہائی خوشی اور رضامندی کے ساتھ بیعت کی۔ آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ "اگر میں صلح کر دوں تو تم کو صلح کرنا ہو گی اور اگر میں جنگ کروں تو تمہیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہو گی"۔ سب نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ آپ نے انتظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیا۔ اطراف میں عمال مقرر کیے، احکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

یہ وقت وہ تھا کہ دمشق میں امیر شام معاویہ کا تختِ سلطنت پر قبضہ مضبوط ہو چکا تھا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ صفین میں جو لڑائیاں امیر شام کی ہوئی تھیں ان کا نتیجہ تحکیم کی سازشانہ کارروائی کی بدولت امیر شام کے موافق نکل چکا تھا اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی سلطنت کے اندر جہاں اب حضرت امام حسنؑ حکمران ہوئے تھے باہمی تفرقے اور بددلی پیدا ہو چکی تھی۔ خود جناب امیرؑ کے احکام کی تعمیل میں جس طرح کوتاہیاں کی جاتی تھیں وہ حضرتؑ کے آخر عمر کے خطبوں سے ظاہر ہے۔ خوارج نہروان کا فتنہ مستقل طور پر بے اطمینانی کا باعث بنا ہوا تھا جن کی اجتماعی طاقت کو اگرچہ نہروان میں شکست ہو گئی تھی مگر ان کے منتشر افراد اب بھی ملک کے امن و امان کو صدمہ پہنچانے پر تلے ہوئے تھے یہاں تک کہ بظاہر اسی جماعت کا ایک شخص تھا جس نے حضرت امیرؑ

کے سر پر مسجد میں ضربت لگائی - اور جس کے صدمہ سے آپ کی وفات ہوئی تھی -

ابھی ملک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ امیر شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکنوں نے اپنی کارروائیاں جاری کر دیں۔ چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوش گوار بنائیں غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے یہاں باز آتے" تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے ہیں" معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہش مند ہو" ایسا ہے تو پھر تیار رہو" یہ منزل کچھ دور نہیں ہے" نیز مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہمیں اس حادثے سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمہیں ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر اپنی دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے۔"

اس خط کے بعد امیر شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی رد و بدل ہوئی۔ امیر شام کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اہل کوفہ کے باہمی تفرقہ اور بددلی اور دلی کمزوریوں کا علم ہو گیا۔ اس لیے وہ سمجھے کہ یہی موقع ہے کہ عراق پر حملہ کر دیا جائے چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر عراق کے حدود تک پہنچ گئے اس وقت حضرت امام حسنؑ نے بھی مقابلہ کی تیاری کی اور حجر ابن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے اطراف ملک کے حکام کو مقابلے

کے لیے آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں مگر جو خیال تھا وہی ہوا کہ عام طور پر سرد مہری
سے کام لیا گیا۔ تھوڑی فوج تیار ہوئی تو ان میں کچھ فرقۂ خوارج کے لوگ تھے کچھ شورش پسند اور
مال غنیمت کے طلب گار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے شریک تھے۔
بہت کم وہ لوگ تھے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہوں۔

ادھر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر ابن کریز کو آگے روانہ کیا اور اس نے مقام انبار میں
جا کر چھاونی چھائی۔ ادھر حضرت امام حسنؑ اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے اور مقام
دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں کی حالت کا جائزہ
لینے کے لیے سب کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو مجھے
کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے۔ میں تمہارا اتنا ہی بہی خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت
مجھے ہونا چاہیے۔ میں تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کن رائے قائم کر رہا ہوں۔ امید ہے
کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد
سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمہیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور
کروں۔ اس تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ یقینی علیؑ ایسے بہادر باپ کا
بہادر فرزند تن تنہا اس ہنگامہ آور جماعت کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر یہ کھلم کھلا
دشمنوں کی جماعت ہوتی۔ مگر اس کے پہلے خود حضرت علیؑ بھی اس وقت بظاہر بے بس ہو گئے
تھے جب نیزوں پر قرآن اونچے کیے جانے کے بعد صفین میں خود آپ کی فوج کے آدمی آپ کو گھیر کر
کھڑے ہو گئے تھے کہ اب آپ جنگ کو روک دیجیے نہیں تو ہم آپ کو قید کر کے دشمن کے سپرد کر دیں گے اس وقت
جناب امیرؑ نے ایسا نہیں کیا کہ تلوار لے کر ان سے لڑنے لگتے بلکہ مجبوراً جنگ کو ملتوی فرمایا۔ اس سے
زیادہ سخت صورت ہے اس وقت امام حسنؑ کو سامنا کرنا پڑا کہ مجمع نے آپ پر حملہ کر دیا اور یہ
مصلاً قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ چادر آپ کے دوش سے اتار لی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے
اور آواز بلند کی کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔" فوراً دونوں جاں نثار قبیلے ادھر

اُدھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دور کیا۔ آپ یہاں سے مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر جراح ابن قبیصہ اسدی ایک شخص یعنی خوارج میں سے کمین گاہ میں چھپ گیا اور اس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہو گئی۔ حملہ آور گرفتار کیا گیا اور اُسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیاری کی۔

صلح

امیر شام کو حضرت امام حسن علیہ السلام کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا حال معلوم ہو چکا تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کے لیے جنگ کرنا ممکن نہیں ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کتنے ہی بے بس اور بے کس ہوں مگر وہ علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے اور پیغمبر کے نواسے ہیں اس لیے وہ ایسے شرائط پر ہرگز صلح نہ کریں گے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ ابن عامر کے ذریعہ سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے پیچھے نہ پڑو اور خوں ریزی نہ ہونے دو۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی گئیں۔ اور کچھ بزدلوں کو اپنی تعداد کی زیادتی سے خوف زدہ کیا گیا اور دوسری طرف حضرت امام حسنؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر کہیں انھی شرائط پر میں صلح کے لیے تیار ہوں۔

امام حسنؑ یقیناً اپنے ساتھیوں کی غداری کو دیکھتے ہوئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پیش نظر تھا کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ باطل کی تقویت کا دھبہ میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس گھرانے کو حکومت و اقتدار کی ہوس تو کبھی تھی ہی نہیں تھی تو مطلب بس یہ تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا ہو۔ اب معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا شخصی اقتدار کی خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار پا سکتا تھا۔ یہ کہ امیر شام صلح کے شرائط پر عمل نہ کریں گے بعد کی بات تھی جب تک صلح نہ ہوتی یہ انجام سامنے آ کہاں سکتا تھا اور حجت

تمام کیونکر ہو سکتی تھی، پھر بھی آخری جواب دینے سے قبل آپ نے ساتھ والوں کو جمع کیا اور تقریر فرمائی۔ "آگاہ رہو کہ تم میں دو خوں ریز لڑائیاں ہو چکیں ہیں جن میں بہت لوگ قتل ہوئے کچھ مقتول صفین میں ہوئے جن کے لیے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو۔ اب اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ کے بھروسے پر تلواروں سے فیصلہ کرائیں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہاری مرضی پر عمل کریں۔" جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ "ہم زندگی چاہتے ہیں، ہم زندگی چاہتے ہیں۔ آپ صلح کر لیجیے۔" اس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کیے۔

شرائط صلح

اس صلح نامہ کے مکمل شرائط حسب ذیل تھے:-

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کریں گے۔

(۲) یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی ہیں ان کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے

(۵) معاویہ حسنؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ ابن علیؑ اور خاندان رسولؐ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ۔ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا اور ڈرایا نہیں جائے گا۔

(۶) جناب امیر علیہ السلام کی شان میں کلمات نازیبا جواب تک مسجد جامع اور قنوت نماز میں استعمال ہوتے رہے ہیں وہ ترک کر دیے جائیں۔ آخری شرط کی منظوری میں معاویہ کو عذر ہوا اور یہ طے پایا کہ کم از کم جس موقع پر امام حسن علیہ السلام موجود ہوں اس موقع پر ایسا نہ کیا جائے۔ یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ سنہ ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

صلح کے بعد فوجیں واپس چلی گئیں۔ معاویہ کی شہنشاہی ممالکِ اسلامیہ میں عمومی طور پر مسلّم ہوگئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران نے بھی اطاعت کرلی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو اس صلح کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرف سے جس طرح کے دل خراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا ان کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ لوگ جو کل تک امیرالمومنین کہہ کے تسلیم بجا لاتے تھے "آج مذل المومنین" یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے کے الفاظ سے سلام کرنے لگے۔ مگر امام حسن علیہ السلام نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے۔ مگر ادھر یہ ہوا کہ امیر شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مضبوط ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ "میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو، روزے رکھنے لگو، حج کرو، یا زکوٰۃ ادا کرو، یہ سب تو تم کرتے ہی ہو، میرا مقصد تو بس یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلّم ہو جائے اور یہ مقصد میرا حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد پورا ہو گیا۔ اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں، ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے۔" مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کھولتا۔ انتہا یہ کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں امیر شام نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں کلمات نازیبا استعمال کیے جس کو سن کر امام حسینؑ بھائی کی جانب سے جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا۔ اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا۔ اسی طرح جتنی شرطیں معاہدہ

کی تھیں امیر شام نے سب کی مخالفت کی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں کیا۔

باوجودیکہ آپ بالکل خاموشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ مگر آپ خود بھی اس دور میں بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ ایک طرف غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی بلندی مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے جیسا کثرت ازدواج اور کثرت طلاق۔ یہ چیز اپنی جگہ پر شریعت اسلام میں جائز ہے مگر بنی امیہ کے پروپیگنڈہ نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقے پر پیش کیا جو ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ دوسرے بنی امیہ کے ہواخواہوں کا برابر تاؤ سخت کلامی اور دشنام دہی اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے تھے جب امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ مروان رو رہا تھا امام حسین علیہ السلام نے فرمایا "آج تم روتے ہو۔ حالانکہ اس کے پہلے تم انھیں غم و غصہ کے گھونٹ پلاتے تھے جنھیں دل ہی خوب جانتا ہے"۔ مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا۔"

اخلاق و اوصاف

امام حسنؑ کی ایک غیر معمولی صفت جس کے دوست اور دشمن سب معترف تھے وہ یہی حلم کی صفت تھی جس کا اقرار ابھی مروان کی زبان سے آپ سن چکے ہیں حکومت شام کے ہواخواہ صرف اس لیے جان بوجھ کر سخت کلامی اور بد زبانی کرتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کو غصہ آ جائے اور کوئی ایسا اقدام کر دیں جس سے عہد شکنی کا الزام آپ کی طرف عائد کیا جا سکے اور اس طرح خون ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے مگر آپ ایسی صورتوں میں حیرت ناک قوت برداشت سے کام لیتے تھے، جو کسی دوسرے انسان کا کام نہیں ہے۔ آپ کی سخاوت اور مہمان نوازی بھی عرب میں مشہور تھی۔ آپ نے تین مرتبہ اپنا تمام مال

راہ خدا میں لٹا دیا اور دو مرتبہ تمام اپنی ملکیت، یہاں تک کہ اثاث البیت اور لباس تک کو آدھوں آدھ راہ خدا میں دے دیا۔

سائلوں کو ایک ایک دفعہ میں ہزاروں روپے دے دیے ہیں اور حقیقت میں معاویہ کے ساتھ شرائط صلح میں جو بہت سے مورخین کے بیان کے مطابق ایک خاص رقم کی شرط ملتی ہے کہ معاویہ کی جانب سے ہر سال امام حسن علیہ السلام کے پاس روانہ کی جائے وہ اگر صحیح ہو تو اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ روپیہ مستحقین تک بھی پہنچ سکے۔ ہرگز اپنی ذات پر صرف کرنے کے لیے آپ نے اس رقم کی شرط قرار نہیں دی تھی چنانچہ جو کچھ پاس موجود ہوتا تھا چاہے زیادہ سے زیادہ رقم کیوں نہ ہو آپ فوراً سائلوں کو عطا فرما دیتے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ " باوجودیکہ آپ خود ضرورت مند ہیں پھر بھی کیا بات ہے کہ سائل کو رد نہیں فرماتے "؟ آپ نے فرمایا " میں خود خدا کی بارگاہ کا سائل ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ خود سائل ہوتے ہوئے دوسرے سائلوں کے سوال کو رد کروں اس صورت میں مجھے کیا حق ہوگا کہ میں خدا سے اپنے سوال کے پورا ہونے کی تمنا رکھوں "۔

اس کے ساتھ آپ کے علمی کمالات بھی وہ تھے جن کے سامنے دنیا سر خم کرتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ ابن عباسؓ امیرالمومنینؑ سے حاصل کیے ہوئے علوم کو دنیائے علم میں اپنا ڈنکا بجا رہے تھے۔ مگر جب امام حسن علیہ السلام کے خداداد علم کا سامنا ہو جاتا تھا تو خاندان رسالتؐ کی بزرگی کا دنیا کو اقرار کرنا پڑتا تھا چنانچہ ایک سائل نے مسجد نبوی میں آکر ایک آیت کی تفسیر ابن عباس سے بھی پوچھی، عبداللہ ابن عمر سے بھی پوچھی اور پھر امام حسن علیہ السلام سے دریافت کی اور آخر اس نے اقرار کیا کہ امام حسن علیہ السلام کا جواب یقیناً ان دونوں سے بہتر تھا۔ اکثر آپ نے اپنے

دشمن معاویہ کے دربار اور وہاں کے مخالف ماحول میں فضائل اہلبیت اور
مناقب امیر المومنین پر ایسی مؤثر تقریریں فرمائی ہیں کہ دشمنوں کے سر جھک گئے اور آپ کی
فصاحت و بلاغت اور حقانیت کا ان کے دلوں پر سکہ قائم ہو گیا۔
عبادت بھی آپ کی امتیازی حیثیت رکھتی تھی، بیس یا پچیس حج پا پیادہ
کیے جب موت قبر، قیامت اور صراط کو یاد فرماتے تھے تو رونے لگتے تھے جب
بارگاہ الٰہی میں اعمال کے پیش ہونے کا خیال آتا تھا تو ایک نعرہ مار کر بیہوش
ہو جاتے تھے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو جسم لرزنے لگتا تھا۔

وفات

اس بے ضرر اور خاموش زندگی کے باوجود بھی امام حسن علیہ السلام کے خلاف
وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر صرف کیا جاتا رہا
تھا امیر شام نے اشعث ابن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن علیہ السلام کی زوجیت
میں تھی ساز باز کر کے ایک لاکھ درہم انعام اور اپنے فرزند یزید کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا اور
اس کے ذریعے سے حضرت کو زہر دلوایا امام حسنؑ کے کلیجہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور حالت خراب
ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی امام حسینؑ کو پاس بلایا۔ اور وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے جد بزرگوار
رسول خدا کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرہ خون گرنے نہ پائے میرے
جنازے کو واپس لے آنا۔ اور جنت البقیع میں دفن کرنا۔ ۲۸ صفر ۵۰ھ کو امام حسنؑ دنیا
سے رخصت ہو گئے حسینؑ حسب وصیت بھائی کا جنازہ روضۂ رسول کی طرف لے گئے مگر
جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان وغیرہ نے مخالفت
کی نوبت پہنچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش کر دی اور کچھ تیر جنازہ امام حسنؑ تک پہنچے
بنی ہاشم کے اشتعال کی کوئی انتہا نہ تھی مگر امام حسین علیہ السلام نے بھائی کی وصیت پر عمل کیا
اور امام حسن علیہ السلام کا تابوت واپس لا کر جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

16

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی

آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۳
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
سرفراز پریس لکھنؤ

از سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت دو آنے

محصول ڈاک ۸ر

تعارف

(دوسرا ایڈیشن)

اس رسالے میں تیسرے امام حسین ابن علی شہید کربلا کے مختصر حالاتِ زندگی ہیں۔ مصنفِ کتاب جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ نے اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے اس اختصار میں حد کی وضاحت پیدا کر دی ہے۔ امام حسینؑ کی پیدائش سے لے کر شہادت کے وقت تک کے قریب قریب کل حالات اس میں موجود ہیں اور آپ کی سیرت کا تقریباً ہر پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ اس امام عالی مقام سے محبت رکھنے والے ذی استطاعت حضرات کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس رسالے کو کثیر تعداد میں خرید فرما کر مفت تقسیم کرائیں اور اپنے یہاں کی مجلسوں میں تبرک کا بدل قرار دیں۔

یہ اپنے سلسلہ کی چوتھی سوانح عمری ہے۔ انشاء اللہ ادارہ جلد سے جلد اسی انداز پر کل اماموں کی سوانح عمریاں شائع کرے گا۔ اتنی مختصر سوانح حیات شائع کرنے کا خاص مقصد یہ ہے کہ افرادِ قوم اپنے بچوں کو انہیں زبانی یاد کرا دیں۔

خادم مشن

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

۲۰/اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء

۳

[illegible]

انسانی زندگی کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا پڑتا ہے۔ ایک طرف اُسے اپنے انسانیت کے بلند خدوخال کو قائم رکھنے کے لیے خود اپنی نفسانی خواہشوں، حیوانی جذبوں اور شیطانی تقاضوں سے عقل کی رہنمائی اور فرض شناسی کے اصولوں کی پابندیوں کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے۔ دوسری طرف سچائی کے راستے میں جو بیرونی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اُن کے مقابلے کی ضرورت ہو۔ ماحول، رفتارِ زمانہ، ظلم اور تشدد کی طاقتیں اس کو اکثر راستے سے ہٹا دینے یا سیلاب کے بہاؤ اور آندھیوں کے تیز جھکڑوں اور طوفان کے سخت تھپیڑوں سے دوچار کر دیتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سختی کے ساتھ سچائی کے راستے پر قائم رہنا، جان پر کھیل جانا اور اصولوں سے بال برابر نہ ہٹنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ لفظی طور پر ثابت قدمی، استقلال، ضبط، صبر اور تحمل کی لفظیں اخلاق کی کتابوں اور حکیموں کی نصیحتوں میں بہت مل جائیں گی، مگر مشکل منزلوں میں اور دشوار راستوں میں انسان کا قدم آگے بڑھانے اور حوصلہ کو قائم رکھنے اور ڈگمگاتے ہوئے پیروں میں استقلال پیدا کرنے کے لیے ایک عملی نمونے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے راہ نما کی حاجت ہے جو سخت سے سخت منزلوں کو طے کیے ہوئے، اس آزمائش کی کڑیوں کو جھیلے ہوئے، مشکلات کی گھاٹیوں اور ناہموار راہوں کو روندے ہوئے کامیابی کی سب سے

اونچی چوٹی پر کھڑا ہوا دنیا کو آواز دے رہا ہو کہ "آؤ اور میرے نقشِ قدم پہ
چل کر سچائی، حقانیت اور صبر و استقلال کی اس معراج کو حاصل کرو"۔ یہ ہیں
شہیدِ کربلا حسینؑ ابن علیؑ جن کے حالات کا ایک مختصر خاکہ اس رسالہ میں پیش
کیا جا رہا ہے۔

نام و نسب

حضرت ابو عبداللہ الحسینؑ جو آلِ رسولؐ میں سے تیسرے امام ہیں۔
پیغمبرِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نواسے اور
حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔
آپ کی والدہ گرامی حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وہ باعزت بیٹی تھیں
جن کی تعظیم کو حضرت کھڑے ہوتے تھے۔ جن کو تمام مسلمان حضرت سیدہؑ اور معصومہؑ
کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جنھیں مسلمان گھروں میں حضرت بی بی کے مقدس نام سے
یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا نام حضرت فاطمہ زہرا تھا اور رسولؐ نے سیدۂ نسوانِ عالم کا
انھیں خطاب دیا تھا۔ ایسے باپ اور ماں کے بیٹے اور ایسے نانا کے نواسے حسینؑ تھے۔

ولادت

ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن امام حسین علیہ السلام
کی ولادت ہوئی۔ اس خوش خبری کو سن کر جنابِ رسالتمآب
صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لائے۔ بیٹے کو گود میں لیا، پیار کیا، داہنے کان میں
اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منہ میں دے دی۔ پیغمبر کا مقدس لعابِ
دہن حسینؑ کی غذا بنا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا گیا۔ آپ کی پیدائش سے تمام خاندان میں
خوشی اور مسرت محسوس کی جاتی تھی مگر آنے والے حالات کا علم پیغمبرؐ کی آنکھوں
سے آنسو برساتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسینؑ کے مصائب کا چرچا اہلِ بیتِ رسولؐ کی
زبانوں پر آنے لگا۔

نشوونما

پیغمبرِ اسلام کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی۔ اب ان دو بچوں کی
پرورش میں مصروف ہوئی۔ ایک حسنؑ، دوسرے حسینؑ۔ اور اس

طرح ان دونوں کا اور اسلام کا ایک ہی گہوارہ تھا جس میں دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک طرف پیغمبر اسلام جن کی زندگی کا مقصد ہی اخلاق انسانی کی تکمیل تھی اور دوسری طرف حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالبؑ جو اپنے عمل سے خدا کی مرضی کے خریدار بن چکے تھے۔ تیسری طرف حضرت فاطمہ زہراؑ جو خواتین کے طبقہ میں پیغمبر کی رسالت کو عملی طور پر پہنچانے ہی کے لیے قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نورانی ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔

رسولؐ کی محبت

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ انتہائی محبت فرماتے تھے سینہ پر بٹھاتے تھے۔ کاندھوں پر چڑھاتے تھے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان سے محبت رکھو مگر چھوٹے نواسے کے ساتھ آپ کی محبت کے انداز کچھ امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ایسا ہوا ہے کہ نماز میں سجدہ کی حالت میں حسینؑ پشت مبارک پر آ گئے تو سجدہ میں طول دیا۔ یہاں تک کہ بچہ خود سے بخوشی پشت پر سے علاحدہ ہو گیا اُس وقت سر سجدے سے اُٹھایا۔ کبھی خطبہ پڑھتے ہوئے اور حسینؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے تو رسولؐ نے اپنا خطبہ قطع کر دیا اور منبر سے اتر کر بچے کو زمین سے اُٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "دیکھو یہ حسینؑ ہے، اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو۔" رسولؐ نے حسینؑ کے لیے یہ الفاظ بھی خاص طور پر فرمائے تھے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔" مستقبل نے بتا دیا کہ رسول کا مطلب یہ تھا کہ میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔

رسولؐ کی وفات کے بعد

امام حسین علیہ السلام کی عمر ابھی چھ سال کی تھی جب انتہائی محبت کرنے والے نانا کا سایہ

سر سے گذر گیا۔ آپ تیس برس تک حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خانہ نشینی
کا دور ہے۔ اس زمانہ کے طرح طرح کے ناگوار حالات امام حسینؑ دیکھتے رہے اور اپنے
والد بزرگوار کی سیرت کا بھی مطالعہ فرماتے رہے یہ کیا دور تھا جس کو آپ نے
جوانی کے حدود میں قدم رکھا اور بھرپور شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ ۳۵ھ میں
جب حسینؑ کی عمر ۳۱ برس کی تھی تمام مسلمانوں نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو بحیثیت
خلیفۂ اسلام تسلیم کیا۔ یہ امیر المومنین کی زندگی کے آخری پانچ سال تھے جن میں
جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور امام حسینؑ ان میں اپنے بزرگ
مرتبہ باپ کی نصرت اور حمایت میں شریک ہوئے اور شجاعت کے جوہر بھی دکھا
دئیے۔ ۴۰ھ میں جناب امیر علیہ السلام مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور اب امامت
و خلافت کی ذمہ داریاں امام حسن علیہ السلام کے سپرد ہوئیں جو حضرت امام حسینؑ
کے بڑے بھائی تھے۔ حسینؑ نے ایک باوفا اور اطاعت شعار بھائی کی طرح حسنؑ
کا ساتھ دیا اور جب امام حسن علیہ السلام نے اپنے شرائط کے ماتحت جن سے
اسلامی مفاد محفوظ رہ سکے معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو امام حسین علیہ السلام بھی
اس مصالحت پر راضی ہو گئے اور خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ دس برس تک
امام حسن علیہ السلام کی زندگی میں اور دس برس تک امام حسن علیہ السلام کے بعد
آپ خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت اور شریعت کی تعلیم و اشاعت
میں مصروف رہے۔ مگر معاویہ نے ان شرائط کو جو امام حسن علیہ السلام کے
ساتھ ہوئے تھے بالکل پورا نہ کیا۔ خود امام حسن علیہ السلام کو امیر شام کی سازش
ہی سے زہر دیا گیا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے شیعوں کو چن چن کے قید کیا
گیا، سر قلم کیے گئے، اور سولی پر چڑھایا گیا اور سب سے آخر میں اس شرط کے
بالکل خلاف کہ "معاویہ کو اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا"
معاویہ نے یزید کو اپنے بعد کے لیے ولی عہد بنا دیا اور تمام مسلمانوں سے اس کی

بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور زور و زر دونوں طاقتوں کو کام میں لا کر دنیائے اسلام کے بڑے حصے کا سر جھکوا دیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

امام حسین علیہ السلام سلسلۂ امامت کی تیسری فرد تھے۔ عصمت و طہارت کا مجسمہ تھے۔ آپ کی عبادت، آپ کے زہد، آپ کی سخاوت اور آپ کے کمالِ اخلاق کے دوست و دشمن سب ہی قائل تھے۔ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اور اکثر روزے رکھتے تھے۔ پچیس حج آپ نے پاپیادہ کیے۔ آپ کی شجاعت و سخاوت کی عظمت کو خود رسول اللہؐ نے بچپنے میں ایسا نمایاں پایا کہ فرمایا "حسین میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے"۔ چنانچہ آپ کے دروازے پر مسافروں اور حاجت مندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا تھا اور کوئی سائل محروم واپس نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا لقب "ابو المساکین" ہو گیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے جن کے نشان پشتِ مبارک پر پڑ گئے تھے۔ حضرت ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب کسی صاحبِ ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو کم سے کم اپنی ہی عزتِ نفس کا خیال کرو۔"

غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ آپ عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے زرا زرا سی بات پر آپ انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات کے سامنے دنیا کا سر جھکا ہوا تھا۔ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ صحیفۂ حسینیہ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے۔ آپ رحم دل ایسے تھے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔

ان تمام بلند صفات کے ساتھ متواضع اور منکسر ایسے تھے کہ راستے میں چند مساکین بیٹھے ہوئے اپنے ٹھیکرے کے ٹکڑے کھا رہے تھے اور آپ کو پکار کر کھانے میں شرکت کی دعوت دی تو حضرت فوراً زمین پر بیٹھ گئے اگرچہ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی۔ اس بناء پر کہ صدقہ آلِ محمدؐ پر حرام ہے۔ مگر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی عذر نہیں ہوا۔

اس خاکساری کے باوجود آپ کی بلندی مرتبہ کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوتے تھے لوگ نگاہ اُٹھا کر بات نہیں کرتے تھے جو لوگ آپ کے خاندان کے مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے امیر شام معاویہ کو ایک سخت خط لکھا جس میں اُن کے اعمال و افعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر معاویہ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدیوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا ہی سخت خط لکھیے۔ معاویہ نے کہا میں جو کچھ لکھوں وہ اگر غلط ہو تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسینؑ میں مجھے ڈھونڈھنے سے کوئی عیب نہیں ملتا۔

آپ کی اخلاقی جرأت، راست بازی اور راست کرداری، قوتِ اقدام، جوشِ عمل اور ثبات و استقلال، صبر و برداشت کی تصویریں کربلا کے مرقع میں محفوظ ہیں۔ ان سب کے ساتھ آپ کی امن پسندی یہ تھی کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر عزم وہ تھا کہ جان دے دی جو صحیح راستہ پہلے دن اختیار کر لیا تھا۔ اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔ اُنھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بڑے بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ اپنے وقت میں وہ اطاعت بھی بے مثل اور دوسرے وقت میں یہ قیادت بھی لاجواب تھی۔

واقعۂ کربلا

حضرت امام حسین علیہ السلام سے اور امیر شام معاویہ ابنِ ابو سفیان سے جو صلح ہوئی تھی اُس کی ایک خاص اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے

بعد کسی جانشین کے مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا مگر سب شرطوں کو کلی طور سے پامال کرتے ہوئے
معاویہ نے اس شرط کی بھی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد
اپنا نامزد کرنا کیسا بلکہ اپنی زندگی ہی میں ممالک اسلامیہ کا دورہ کر کے بحیثیت آئندہ خلیفہ کے یزید
کی بیعت حاصل کر لی۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے بیعت سے انکار فرما دیا۔
امیر شام نے آپ کو موافق بنانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکامیابی ہوئی۔
یزید نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اس کی خلافت ناجائز تھی بلکہ اپنے اخلاق، اوصاف اور
کردار کے لحاظ سے اتنا پست تھا کہ تخت سلطنت پر اس کا برقرار ہونا اسلامی شریعت
کے لیے سخت خطرے کا باعث تھا۔ وہ شراب خوار، بدکار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب
تھا جن کا ذکر بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے، اس پر طرہ یہ کہ وہ حضرت امام حسین
علیہ السلام سے بیعت لینے پر مصر تھا، گویا وہ اپنے خلاف شریعت افعال کی صحت کے لیے
پیغمبر اسلام کے نواسے سے سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔

معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلی فکر اس کو یہی ہوئی
کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت حاصل کی جائے اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ
میں تھا معاویہ کی خبر انتقال کے ساتھ بیعت کے لیے بھی لکھا۔ ولید نے جو مدینہ کا گورنر
تھا امام حسین علیہ السلام کو بلا کر یزید کا پیغام پہنچایا۔ آپ پہلے ہی سے یہ طے کیے ہوئے تھے
کہ یزید کی بیعت آپ کے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو نتائج
ہوں گے انھیں بھی خوب جانتے تھے مگر دین خدا کی حفاظت اور شریعت اسلام کی
خاطر آپ کو سب گوارا تھا۔ آپ ولید کو مناسب جواب دے کر اپنے مکان پر واپس
آئے۔ مدینہ میں قیام اس کے بعد نامناسب خیال فرما کر ہجرت کا مضبوط ارادہ کر لیا۔
سنہ ۶۰ھ رجب کا مہینہ ۲۸ تاریخ تھی جب حضرت نے اپنے نانا کے جوار کو چھوڑ کر
ظالموں کے جور و ستم سے سفر غربت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظمہ عرب کا بین الاقوامی
قانون اور پھر اسلامی تعلیمات کے رو سے جائے پناہ اور امن و امان کی جگہ تھی آپ نے

مکہ میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے قیام فرمایا۔ آپ کے ساتھ آپ کے قریبی اعزہ تھے
جن میں خاندان رسول کی محترم بیبیاں اور کم سن بچے بھی تھے۔ آپ اپنی طرف سے کسی خونریزی
اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حج کا زمانہ قریب تھا اور حضرت کی دلی تمنا تھی کہ
اس سال خانۂ کعبہ کا حج ضرور فرمائیں جب کہ آپ مکہ ہی میں موجود ہیں مگر اسباب ایسے
پیدا ہو گئے کہ وہ بزرگوار جو اس کے پہلے پچیس حج خانۂ کعبہ کے اپنے وطن مدینہ سے آکر پاپیادہ
بجا لا چکا تھا اس وقت مکہ میں موجود ہونے پر بھی حج کرنے سے مجبور ہو گیا۔ ظالم حکومت
شام کی طرف سے کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ جس حالت میں بھی
موقع ملے حضرت امام حسین علیہ السلام کو خانۂ کعبہ کے پاس ہی قتل کر ڈالیں۔

حضرت نہ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے مکہ کے اندر خون ریزی ہو اور خانۂ کعبہ
کی حرمت برباد ہو۔ دو روز حج کو باقی تھے جب آپ تمام اہل و عیال اور اعزہ کے ساتھ
مکہ معظمہ سے روانہ ہو گئے۔ اب آپ کہاں جاتے۔ کوفہ کے لوگ برابر خطوط لکھ رہے تھے کہ
آپ یہاں تشریف لائیں اور ہماری رہنمائی فرمائیں۔ جب کہ آپ مکہ سے نکلنے پر
مجبور ہو چکے تھے تو اب کوفہ ہی وہ مقام ہو سکتا تھا جس کی طرف آپ رخ کرتے۔ یہاں کے
حالات کو دیکھنے کے لیے آپ اپنے چچا زاد بھائی جناب مسلم ابن عقیلؑ کو بھیج چکے تھے۔
۸ ذی الحجہ کو حضرت مکہ معظمہ سے کوفہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر یہی وہ وقت
تھا جب کوفہ میں انقلاب ہو چکا تھا۔ شروع میں تو کوفہ کے لوگوں نے حضرت مسلمؑ کا خیر مقدم
کیا اور اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی مگر جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے
حاکم کوفہ نعمان ابن بشیر کو معزول کیا اور ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔

یہ شخص بڑا ہی ظالم اور تشدد پسند تھا اس نے کوفہ میں آکر بڑے سخت احکام نافذ
کیے اور تمام اہل کوفہ پر خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ سب نے جناب مسلمؑ کا ساتھ
چھوڑ دیا۔ اور آخر تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بڑی مظلومی اور بے کسی کے
ساتھ ۹ ذی الحجہ کو وہ شہید کر ڈالے گئے۔ حضرت امام حسینؑ عراق کے راستے میں منزل با

پہنچے۔ جب حضرت کو مسلم کی خبر شہادت معلوم ہوئی۔ اس کا حضرت پر بڑا اثر پڑا مگر
عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا، سفر جاری رہا۔
یہاں تک کہ قادسیہ کی منزل میں ابن زیاد کی فوج میں سے ایک ہزار کا لشکر حر ابن یزید
ریاحی کی سرداری میں آپ کا راستہ روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ یہ دشمن کی فوج تھی مگر
حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے ساتھ بہتر کرم کا مظاہرہ فرمایا جو رہتی دنیا تک
انسانیت میں یادگار رہے گا۔ تمام فوج کو پیاسا دیکھ کر جتنا پانی ساتھ تھا سب پلا دیا
حالانکہ آپ اس کے لیے اپنے اہل حرم اور بچوں کی پیاس کے لحاظ سے پانی کا تو کوئی
ذخیرہ محفوظ نہ رکھا۔ اس کے بعد یزید کی فوج نے اپنے حاکم کی ہدایت کے مطابق آپ
کے ساتھ تشدد اختیار کیا۔ آپ کو آگے جانے یا واپس جانے سے روک دیا۔ اب محرم
کا پہلا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ دوسری محرم کو حضرت کربلا کی زمین پر پہنچے اور
یہیں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان
میں آنا شروع ہو گیا۔ اور تمام راستے بند کر دیے گئے۔ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ
صرف بہتر جانباز تھے اور ادھر ہزاروں کا لشکر۔

سات دن تک امن قائم رکھنے کے لیے صلح کی کوشش ہوتی رہی۔ حضرت یہاں
تک تیار ہوئے کہ عرب کا ملک چھوڑ دیں، کسی دور دراز سرزمین پر چلے جائیں اور
اس طرح اپنے کو بیعت یزید سے الگ رکھتے ہوئے بھی ایسی صورت پیدا کر دیں کہ
جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر نویں محرم کی سہ پہر کو صلح کے امکانات ختم
ہو گئے۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا، اس
میں لکھا تھا کہ "یا حسین غیر مشروط طور پر اطاعت قبول کریں یا ان سے جنگ
کی جائے۔ اس خط کے پہنچتے ہی فوج یزیدی نے حملہ کر دیا۔

باوجودیکہ ساتویں سے پانی بند ہو چکا تھا، امام حسین علیہ السلام کے سامنے ان
کے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کی بے تابی کے مناظر، العطش کی صدائیں اور قبل

کے حالات سب ہی کچھ تھے۔ مگر یزید کی بیعت اب بھی اُسی طرح غیر ممکن تھی جس طرح اس کے پہلے۔ بے شک آپ نے یہ چاہا کہ ایک رات کی مہلت مل جائے، آپ چاہتے تھے کہ یہ پوری رات آخری طور پر عبادت خدا میں بسر کریں۔ اس کے علاوہ دوست و دشمن دونوں کو جنگ کا قطعی فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنے اپنے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع مل جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کرکے تقریر بھی فرمائی۔ آپ نے فرمایا "کل قربانی کا دن ہے۔ ان ظالموں کو مجھ سے دشمنی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ تم لوگ بھی اپنی زندگی کو میرے ساتھ خطرے میں ڈالو۔ میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ۔" مگر ان جاں بازوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

عاشور کی رات ختم ہوئی۔ دسویں محرم کو صبح سے عصر تک کی مدت میں ان بہادروں نے جو کچھ کہا تھا اُسے کرکے دکھایا۔ اس وفاداری، استقلال اور بہادری کے ساتھ حضرت امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان میں حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، سعید ابن عمرو، انس ابن حارث اور عبدالرحمن ابن عبد ربہ جیسے ساٹھ ستر اور اسی برس کے بڈھے تھے اور متعدد اصحاب رسولؐ بھی تھے۔ بریر ہمدانی، کنانہ ابن عتیق تغلبی، نافع ابن ہلال حنظلہ ابن اسعد جیسے حافظ قرآن تھے اور بہت سے علماء اور راویان حدیث، بہت سے عابد اور شب زندہ دار اور بہت سے ایسے شجاع روزگار تھے جن کی شجاعت کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔

جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے حضرت نے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھے۔ مرنے کے لیے بھیج دیا۔ علی اکبر نے جہاد کرکے اپنی جان دینِ خدا پر نثار کی۔ امام حسین علیہ السلام کو شبیہ رسول کی جدائی کا صدمہ تو بہت ہوا مگر اس کے سامنے ہی آپ کی ہمت کے حوصلے اور

ولولے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عقیل کی اولاد عبد اللہ ابن جعفر کے فرزند ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امام حسن علیہ السلام کے یتیم قاسم کی جدائی آپ کو بہت شاق ہوئی مگر اپنے بزرگ مرتبہ بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے قاسم کو بھی رخصت کر دیا۔

سب کے آخر میں فرزندانِ امیر المؤمنین علیہ السلام میدانِ جہاد میں گئے۔ جب کوئی نہ رہا تو علمدار کی باری آگئی۔ قمر بنی ہاشم ابو الفضل العباسؑ کو حضرت کسی طرح اجازت جہاد نہ دیتے تھے۔ کیوں کہ اُن کے کاندھوں پر اسلام کا علم لہرا رہا تھا۔ مگر آخر ایک طرف بچوں کی پیاس دوسری طرف جوشِ جہاد۔ عباسؑ پانی لینے کے لیے ایک مشک اپنے ساتھ لے کر فرات کی جانب متوجہ ہوئے انھوں نے علم کی حفاظت بھی کی۔ دشمنوں سے مقابلہ بھی کیا۔ فوج کو ہٹا کر نہر کا راستہ بھی صاف کیا اور مشک میں پانی بھی بھر لیا۔ مگر افسوس کہ یہ پانی خیامِ حسینیؑ تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ بہادر علمدار کے شانے قلم ہوئے۔ مشک تیر سے چھد گیا اور پانی زمین پر بہا۔ عباسؑ کی قوت ختم ہو گئی۔ گُرز کے صدمے سے زمین کی طرف جھکے اور علم عباسؑ کے ساتھ زمین پر آ گیا۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہو گئی۔ پشت جھک گئی۔ مگر ہمت پھر بھی نہیں ٹوٹی۔ اب جہاد کے میدان میں حسینؑ کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ مگر فہرست شہداء میں ابھی ایک بے مثال مجاہد کا نام باقی تھا۔ جس کا جواب قربانی کی تاریخ میں نہ پہلے نظر آیا نہ بعد میں نظر آ سکتا ہے۔ یہ چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا جو گہوارہ میں پیاس سے جاں بلب تھا۔ حسینؑ در خیمہ پر تشریف لائے اور اس بچہ کو طلب فرمایا۔ بچے کی عطش اور اس کی حالت کا مشاہدہ فرمایا۔ یقیناً یہ منظر ہر حساس انسان کو متأثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر کیسے بے رحم تھے۔ وہ سخت دل فوجِ شام کے سپاہی جنھوں نے حسینؑ کے ہاتھوں پر اس معصوم بچے کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ رحم کھاتے، بچے کو ایک قطرۂ آب سے سیراب کرتے، ظلم اور شقاوت کا مظاہرہ انتہا حد تک پہنچا دیا، سخت دل حرملہ کا تیر اور بچہ کا نازک گلا۔

امام حسینؑ نے یہ آخری ہدیہ بھی بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا تو خود بہ نفسِ نفیس میدانِ جہاد میں قدم رکھا اور باوجود اس بے کسی اور شکستگی کے جب کہ یقیناً تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے۔ دن بھر اصحاب و اعزّا کی لاشیں اٹھائی تھیں اور بہتّر داغ سینہ پر کھا چکے تھے۔ بھائی کے غم سے کمر شکستہ تھی۔ اور اولاد کے داغ سے کلیجہ زخمی ہو گیا تھا۔ مگر جب نصرتِ اسلام کے لیے تلوار نیام سے نکالی تو دنیا کو حمزہؓ اور جعفرؓ کی شان اور حیدرِ صفدرؑ کی شجاعت یاد دلا دی۔

آخر قربانی کی منزل سامنے آ گئی۔ دشمنوں کی تلواروں، نیزوں اور تیروں سے مقدس جسم، زخموں کی کثرت، خون کے بہنے سے گھوڑے پر سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ دشمنوں نے ایذا رسانی کی کوئی حسرت باقی نہ رکھی۔ شمر کا خنجر فرزندِ رسول کے گلے پر پھرا گویا اسلام کا سر قلم ہوا اور نام نہاد کلمۂ اسلام پڑھنے والوں نے پیغمبرِ اسلام کے نواسے کا سر نیزہ پر بلند کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ خاندانِ رسالت کی مقدس بی بیوں کے سروں سے چادریں اتار لی گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔

امام حسین علیہ السلام کے بعد مردوں میں حضرت کا ایک بیمار فرزند سید سجادؑ باقی تھے جنہیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور بی بیوں اور بچوں کے ساتھ قید کر کے شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام قیدیوں کی صورت سے لے جائے گئے اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں کھڑے کیے گئے۔ ان واقعات کا مختصر تذکرہ حضرت سید سجادؑ کے حالات میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔

ان ظالم مسلمانوں نے تو پیغمبرِ اسلام کے فرزند کو دفن و کفن سے بھی محروم رکھا تھا مگر آس پاس کے رہنے والے قبیلۂ بنی اسد کے لوگوں نے فوجِ ظلم کے چلے جانے کے بعد بارہ محرم کو یعنی شہادت سے تیسرے دن دفن کیا۔

آج کربلا کے میدان میں حسینؑ کا روضہ انتہائی شان و شوکت کے ساتھ

تمام دنیا کے لوگوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور حسینؑ کے نام کا تعزیہ اور ضریح اور علم اور مختلف مظاہرات دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں حسینؑ دنیا میں قائم ہیں اور حسینؑ کی بدولت اسلام باقی ہے اور صداقت و استقلال و حق پرستی کے لیے امام حسین علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ تاریخ انسانیت میں بے مثال حیثیت سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اگر واقعۂ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرے اور سید الشہداءؑ نے کربلا میں جو بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی جاری رہے تو زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔

ہم میں کیا کمی ہے۔ یہی ہے کہ ہم بلند مقاصد کے سامنے اپنے وقتی مفاد، اپنے راحت و آرام، اپنی زندگی، اپنی قرابتوں اور اپنے اہل و عیال اور اولاد اور نہ جانے کتنی روپہلی سنہری مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے یہ مثال پیش کی ہے کہ تم بلند مقاصد کے لیے اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہو۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے دنیا میں پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔
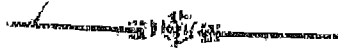
امامیہ مشن کے

مطبوعات خریدیے

اس سے ایک طرف آپ اور آپ کے بچوں کی معلومات
دینی میں اضافہ ہوگا، دوسری طرف ادارہ کو
مزید قومی خدمت کرنے کا موقع ملے گا

پبلشر: سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ

یوسفی پریس لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۲

امامیہ مشن لکھنؤ

مرتبہ

سید العلماء جناب مولانا

سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت ۲/

محصول -/
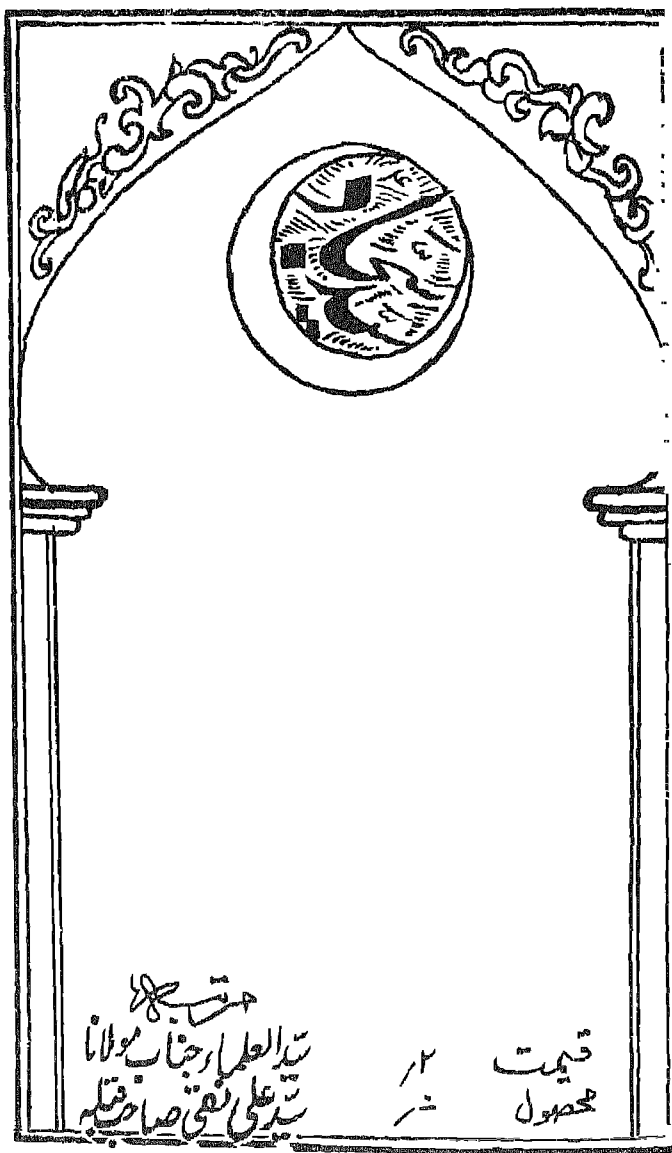
تعارف

زیرنظر رسالہ "سید سجادؑ" کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں ہمارے چوتھے امام کے مختصر سوانح حیات ہیں۔ امامیہ مشن نے طے کیا ہے کہ آئمہؑ کی سوانح عمریاں ایک ایک جزو پر شائع کرے، جس میں نہایت ضروری حالات آسان زبان میں لکھے جائیں۔ جو عام طور پر سب کے لیے مفید ہوں اور جن کا یاد رکھنا بچوں کے لیے بھی آسان ہو، قیمت بھی اتنی کم ہو کہ غلامان آئمہؑ ان رسالوں کو اپنی مجلسوں میں حصہ کی جگہ پر تقسیم بھی کرا سکیں۔ چنانچہ یہ رسالہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سے پہلے "رہبر کامل" کے نام سے حضرت علیؑ کی سوانح عمری شائع ہو چکی ہے۔ اولوالعزم حضرات قوم نے اپنے یہاں کی مجلسوں میں اس رسالہ کو تقسیم بھی فرمایا ہے۔

خادم مشن
سید آفاق حسین رضوی
(آنریری سکریٹری)
۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

۳

سیدِ سجادؑ

دنیا اس وقت مادیت کی گرویدہ ہو رہی ہے اور خدا کو بھولتی جاتی ہے بلکہ بہت کچھ بھول چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زبردست کمزور کو کچل دینا چاہتا ہے۔ ہر طاقت ور بے طاقت کو مٹا دینا چاہتا ہے ہر اکثریت اقلیت کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت اللہ کے بندوں میں خالق کی بندگی اور سچی عبادت کا جذبہ پیدا کیا جائے کیونکہ اگر اللہ کی بندگی پیش نظر رہے تو خدمت خلق سے انسان غافل رہ نہیں سکتا پھر طاقت ور کمزور کو مٹائے گا نہیں بلکہ اپنی قوت و طاقت سے اس کا محافظ بن جائے گا۔ اکثریت اقلیت کو فنا کرنا نہیں چاہے گی بلکہ اس کے لیے سبب پناہ بنے گی۔

اس جذبۂ عبودیت کو پیدا کرنے کے لیے ان خالص بندگانِ خدا کا تذکرہ ہونا چاہیئے جنھوں نے سخت سے سخت موقعوں پر بھی اللہ کی یاد نہیں بھلایا۔

اطمینان اور سکون کے لمحوں میں رسمی طور پر عبادت سب ہی کر سکتے ہیں۔ اور خاطر جمعی کے عالم میں اللہ کو ماننے والے بہت سے اس کا سجدہ کر لیتے ہیں مگر مصیبتوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں تکالیف و شدائد کے ہجوم میں، مظالم کے طوفانوں میں اور باپ بھائی اور دوسرے عزیزوں کی جدائی کے بے پناہ صدموں میں ایسی عبادت کرنا کہ ۔۔۔

"زین العابدینؑ" نام سے زیادہ مشہور لقب ہو جائے اور ایسے سجدے کرنا کہ

"سید سجادؑ" خطاب ہو جاتے صرف مظلوم کربلا حضرت امام حسینؑ کے بیمار فرزند حضرت امام علی ابن الحسینؑ سے مخصوص ہے۔ یہ مختصر صفحات ان ہی کی تاریخ زندگی کا ایک خاکہ پیش کرنے کے لیے لکھے جا رہے ہیں۔

نسب

حضرت سید سجاد وہ مخصوص ہستی ہیں جنھوں نے عرب اور عجم دونوں قوموں کی ممتاز شرافتوں کو اپنی ذات میں جمع کر لیا تھا وہ ددھیال کی طرف سے روحانی اقتدار کے وارث ہوئے تو ننھیال کی جانب سے ایران کے کسریٰ خاندان کی شاہانہ ہمت اور بلند اوصاف کے وارث بھی ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار رسول خداؐ کے نواسے اور علیؑ اور فاطمہؑ کے بیٹے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا تھے اور ان کی والدہ آخری تاجدار ایران یزدجرد کی بیٹی شاہ زنان تھیں جو شہر بانو کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس وقت کہ جب عرب میں نسلی تعصب انتہا درجہ پر تھا عجم کی شہزادی اسیر ہو کر عرب کے ملک میں آئیں۔ کون تھا جو قومی اور نسلی دشمنی کے ہوتے ہوئے شہنشاہ ایران کی لڑکی کو مناسب عزت و احترام کا درجہ دے سکتا۔ ایک انسانیت کے بڑے علم بردار حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہی تھے جنھوں نے ایران کی شہزادی کو اپنے بیٹے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ بیاہ کر عرب کی ملکہ بنا دیا اور خدا نے ان ہی کو حضرت امام زین العابدینؑ کی ماں بننے کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح امام زین العابدینؑ عرب کے سردار حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے پوتے اور عجم کے شہنشاہ یزدجرد کے نواسے تھے اور اسی لیے عرب و عجم سب ہی کی نگاہ میں بڑی عزت کا درجہ رکھتے تھے۔

ولادت

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کوفہ میں مسند خلافت پر متمکن تھے جب ۱۵ جمادی الثانیہ ۳۸ھ میں سید سجاد کی ولادت ہوئی۔

آپ کے دادا حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور سارے خاندان کے لوگ اس مولود کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور شاید علیؑ ہی نے پوتے میں اپنے خد و خال دیکھ کر اُس کا نام اپنے نام پر علیؑ نام رکھا۔

تربیت

حضرت امام زین العابدینؑ کو ماں کی محبت بھری پرورش سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس لیے کہ اُن کا آپ کی ولادت کے بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دو ۲ برس کا سن تھا جب آپ کے دادا حضرت امیر علیہ السلام کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ امام زین العابدین علیہ السلام اپنے چچا حضرت امام حسن علیہ السلام اور والد حضرت امام الحسینؑ علیہ السلام کی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے بارہ ۱۲ برس کی آپ کی عمر تھی جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی۔ اب امامت کی ذمہ داریاں آپ کے والد حضرت امام حسینؑ سے متعلق تھیں۔ شام کی حکومت پر بنی اُمیہ کا قبضہ تھا اور واقعات کربلا کے اسباب حسینی جہاد کی منزل کو قریب سے قریب تر لا رہے تھے۔ جب حضرت زین العابدینؑ بلوغ کی منزلوں پر پہنچ کر جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہے تھے۔ زین العابدینؑ نے آنکھیں کھول کر ان واقعات کی رفتار کو آگے ہی بڑھتے ہوئے دیکھا جنھوں نے بعد میں کربلا کی قربانی کو ضروری قرار دیا۔

شادی

اُسی زمانہ میں جب کہ امام حسینؑ مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور واقعہ کربلا کے اسباب جمع ہو رہے تھے حضرت نے اپنے فرزند سید سجادؑ کی شادی اپنی بھتیجی یعنی حضرت امام حسنؑ کی صاحبزادی کے ساتھ کر دی جن کے بطن سے امام محمد باقرؑ کی ولادت ہوئی۔ اور اس طرح

امام حسینؑ نے اپنے بعد کے لیے سلسلۂ امامت کے باقی رہنے کا سامان خود اپنی زندگی میں کر دیا۔

واقعہ کربلا

سنہ ۶۰ھ میں سید سجادؑ کی عمر ۲۲ سال کی تھی حضرت امام حسینؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور سید سجادؑ بھی ساتھ تھے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ راستہ ہی میں یا کربلا پہنچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہوئے اور دس محرم سنہ ۶۱ھ کو امام حسینؑ کی شہادت کے موقع پر وہ اس قدر بیمار تھے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا اور یقین ہے کہ ساتویں سے پانی بند ہونے کے بعد پھر سید سجادؑ کے لیے بھی پانی کا ایک قطرہ ملنا ناممکن ہو گیا۔ ایک ایسے بیمار کے لیے یہ تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ عاشور کے دن کے اکثر حصے میں وہ غشی کے عالم میں رہے اور اسی لیے کربلا کے جہاد میں اس طرح شریک نہ ہو سکے جس طرح ان کے دوسرے بھائی شریک ہوئے اور اسی لیے حضرت امام حسینؑ آخری رخصت کے وقت وہ وصیتیں جو امامت کے منصب سے متعلق تھیں خود سید سجادؑ کے سپرد نہ فرما سکے بلکہ انہیں ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰؑ کے سپرد فرما دیا۔ اور کہہ دیا کہ جب تمہارے بھائی ہوش میں آئیں تو انہیں دے دینا۔ قدرت کو سید سجادؑ کا امتحان دوسری طرح لینا تھا وہ حسینؑ کے بعد لٹے ہوئے قیدیوں کے قافلہ سالار بننے والے تھے۔ ادھر امام حسینؑ شہید ہوئے اور ادھر ظالم دشمنوں نے خیام اہل بیتؑ کی طرف رخ کر دیا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت کا اہل حرمؑ کا اضطراب خیام میں تہلکہ اور پھر ان ہی خیموں میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے۔ اس وقت سید سجادؑ کا کیا عالم تھا اس کے اظہار

کے لیے کسی زبان یا قلم کو الفاظ ملنا غیر ممکن ہے۔ مگر کیا کہنا زین العابدینؑ کی عبادت خدا کا اُنھوں نے اس بیماری اس مصیبت اور اس آفت میں بھی اپنی عبادت کی شان میں فرق آنے نہ دیا۔ انھوں نے گیارھویں محرم کی شب کو نماز فریضہ کے بعد سجدۂ معبود میں خاک پر سر رکھ دیا اور ایک ہی سجدے میں پوری رات ختم کر دی۔ سجدے میں یہ کلمات زبان پر تھے "لا الٰہ الا اللّٰہ حقاً حقا۔ لا الٰہ الا اللّٰہ ایماناً و صدقا۔ لا الٰہ الا اللّٰہ تعبداً و رقا۔" یعنی کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے جو حق ہے۔ یقیناً حق ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے ایمان کے رُو سے اور سچائی سے۔ کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ گواہی دیتا ہوں میں اُس کی بندگی اور نیاز مندی کے ساتھ، یوں ہی صبح ہو گئی۔

دوسرے دن فوج دشمن کے سالار ابن سعد نے اپنے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نماز پڑھ کر دفن کیا مگر حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کے لاشوں کو اسی طرح بے گور و کفن زمین گرم کربلا پر دھوپ میں چھوڑ دیا۔ یہ موقع سید سجادؑ کے لیے انتہائی تکلیف کا تھا۔ وہ اس وقت جب دشمن کے ہاتھوں قید ہو کر پھوپھیوں، بہنوں اور دیگر اہل حرم کے ساتھ مقتل سے گذر رہے تھے تو یہ حالت تھی کہ قریب تھا روح جسم سے جدا ہو جائے۔ انہیں اس کا صدمہ تھا کہ وہ اپنے باپ اور دوسرے عزیزوں کو دفن نہ کر سکے۔ وہ تو دشمنوں کے ہاتھ میں اسیر تھے اور کربلا سے کوفے جائے جا رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کتنا دل کو بے چین کرنے والا تھا وہ منظر جب خاندان رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ دربار ابن زیاد میں پہنچا۔ سید سجادؑ رسن

کر رہے تھے کہ یہ وہی کوفہ ہے جہاں ایک وقت میں علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور زینبؑ و ام کلثومؑ شاہزادیاں۔ آج اسی کوفہ میں ظالم ابن زیاد تخت حکومت پر بیٹھا ہے۔ اور رسولؐ کا خاندان مقید کھڑا ہے۔ سید سجادؑ ایک بلند انسان کی طرح انتہائی صدمہ اور تکلیف کے ساتھ بھی ایک کوہ وقار بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ابن زیاد نے اس خاموشی کو توڑا۔ یہ پوچھ کر کہ تمہارا کیا نام ہے؟ امامؑ نے فرمایا۔ علی ابن الحسینؑ" وہ کہنے لگا۔ کیا اللہ نے علی ابن حسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" امام نے جواب دیا۔ "وہ میرے ایک بھائی "علی" تھے جنھیں لوگوں نے قتل کر دیا" وہ سرکش جاہل کہنے لگا "نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا" امامؑ نے یہ آیت پڑھی کہ۔ "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا" یعنی اللہ ہی موت کے وقت قبض روح کرتا ہے۔ اس اعتبار سے تمہارا قول درست ہو سکتا ہے۔ اس پر ابن زیاد کو غصہ آگیا اور کہا "تم میں اب بھی مجھ کو جواب دینے اور میری بات رد کرنے کی جرأت ہے" اور فوراً قتل کا حکم دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت زینبؑ دوڑ کر اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا کہ "مجھ کو اس کے ساتھ قتل کیا جائے"۔ سید سجادؑ نے کہا۔ "پھوپھی چھوڑ دیجئے اور مجھے ابن زیاد کا جواب دینے دیجئے" ابن زیاد تو یہ سمجھا تھا کہ کربلا میں آل محمدؐ کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سید سجادؑ کے دل میں موت کا ڈر سما گیا ہوگا اور وہ قتل کی دھمکی سے سہم جائیں گے مگر بہادر حسینؑ کے بہادر فرزند نے تیور بدل کر کہا "ابن زیاد تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ کیا ابھی تک تجھے نہیں معلوم ہوا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت ہے"۔ یہ وہ پرزور الفاظ تھے جنھوں نے ظالم کے سر کو جھکا دیا۔ حکم قتل ختم ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ حسینؑ کی شہادت سے ان کی اولاد اور اہل حرمؑ پر کوئی خوف نہیں چھایا بلکہ قاتل ہی اس

خاندان کے صبر و استقلال کو دیکھ کر خوف زدہ ہو چکے ہیں۔ کوفہ کے بعد یہ قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہوا جس دن دمشق میں داخلہ تھا اس دن وہاں سے بازار خاص تھا سے سجائے گئے تھے اور تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی اور لوگ آپس میں مل رہے تھے۔ اس وقت حسینؑ کے اہل حرم جو تکلیف محسوس کر رہے تھے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایسے وقت انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے۔ مگر وہ سید سجادؑ تھے جو ہر موقع پر ہدایات، اصلاح اور تبلیغی مشن کی تبلیغ کرتے جاتے تھے جس وقت یہ قافلہ بازار سے گذر رہا تھا تو اموی حکومت کے ایک ہوا خواہ نے حضرت سید سجادؑ سے طنزیہ پوچھا "اے فرزند حسینؑ" "کس کی فتح ہوئی؟" آپ نے جواب میں فرمایا "تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ کس کی فتح ہوئی ہے تو جب نماز کا وقت آئے اور اذان و اقامت کہی جائے اس وقت سمجھ لینا کہ کس کی فتح ہوئی؟" اسی طرح اس وقت جب یہ قافلہ مسجد دمشق کے دروازہ پہنچا تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اس نے قیدیوں کو دیکھ کر کہا کہ "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم کو تباہ و برباد کیا اور ملک کو تمہارے مردوں سے خالی اور برائے امن بنایا اور خلیفۂ وقت یزید کو تم پر غلبہ عطا فرمایا۔" ان اسیروں کے قافلہ سالار حضرت سید سجادؑ سمجھ گئے کہ یہ ہم لوگوں سے واقف نہیں ہے۔ فرمایا کہ اے شیخ کیا تو نے یہ آیت قرآن میں پڑھی ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔" کہہ دو اے رسولؐ کہ میں سوائے اپنے اہل بیتؑ کی محبت کے تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بوڑھے نے کہا ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے۔ فرمایا وہ رسولؐ کے اہل بیتؑ ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض ہے۔ یوں ہی خمس والی آیت میں جو ذِی الْقُرْبٰى کا لفظ ہے اور آیۂ تطہیر میں اَهْلَ الْبَيْتِ کا لفظ ہے یہ سب آپ نے اس کو یاد دلایا۔ بوڑھا یہ سن کر تھوڑی دیر حیرت سے خاموش رہا پھر کہا کیا خدا کی قسم تم لوگ وہی ہو؟ سید سجادؑ نے فرمایا۔ ہاں قسم بخدا ہم وہی اہل بیتؑ اور قرابت دار رسولؐ کے ہیں یہ سن کر

بوڑھا شیخ رونے لگا۔ عمامہ سر سے پھینک دیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا "خداوندا گواہ رہنا کہ میں آلِ محمدؐ کے ہر دشمن سے بیزار ہوں۔" پھر امامؑ سے عرض کیا "کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" فرمایا۔ ہاں اگر تو توبہ کرے تو قبول ہو اور تو ہمارے ساتھ ہو گا۔" اس نے عرض کیا "میں اس جرم سے توبہ کرتا ہوں جو میں نے واقف نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی شان میں گستاخی کی۔"

کوفہ میں دربارِ ابن زیاد میں اور پھر بازارِ کوفہ میں اور پھر دمشق میں یزید کے سامنے سید سجادؑ اور دیگر اہلِ حرمؑ کی بہادرانہ گفتگو، خطبے اور احتجاج وہ تھے جنہوں نے دنیا کو شہادتِ حسینؑ کا مقصد بتایا اور اس طرح زین العابدینؑ نے اس مشن کو پورا کیا جسے امام حسینؑ نے انجام دیا تھا۔

رہائی کے بعد

قیدِ شام سے رہائی کے بعد امام زین العابدینؑ مع اہلِ حرمؑ مدینہ گئے اور خاموش زندگی گذارنا شروع کی۔ مگر مدینہ میں اب یزید کی خلافت کے خلاف جذبات بھڑک چکے تھے۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ امام زین العابدینؑ کو اپنے ساتھ شریک کیا جائے مگر امامؑ ان کی نیت اور ان کے ارادوں کی حالت کو خوب جانتے تھے آپ نے ان کا ساتھ دینا منظور نہیں فرمایا۔ اس لیے مدینہ پر جب یزید کی فوج نے چڑھائی کی تو امام زین العابدینؑ کو بلاوجہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مگر آپ کے روحانی صدمہ کے لیے یہی کافی تھا کہ رسول اللہؐ کی مسجد میں تین روز تک گھوڑے بندھتے رہے۔ سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور سیکڑوں شریف عورتوں کی فوجِ یزید کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی۔ یہ مصیبت امام زین العابدینؑ کے لیے نہایت سخت اور ناگوار تھی۔ مگر آپ نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایسے موقع پر جب کہ شہادتِ حسینؑ سے ہر طرف انقلاب برپا تھا اور مختلف جماعتیں خونِ حسینؑ

کا بدلہ لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ کا اس ہنگامہ
سے الگ رہ کر صرف عبادت اور تعلیمات الٰہی کی اشاعت میں مصروف رہنا
ایک عجیب حیرت ناک ضبطِ نفس کا نمونہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیمان ابن صرد خزاعی یا مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی
جنھوں نے قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لیا، امام زین العابدینؑ کے دل میں ان کے ساتھ
ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ آپ نے مختار کے لیے دعائے خیر فرمائی ہے۔ آپ نے برابر لوگوں
سے دریافت کیا ہے کہ کون کون قاتلِ حسینؑ کے قتل ہو گئے۔ یقیناً مختار نے ان قاتلوں
کو ان کے جرائم کی سزا دے کر سید سجادؑ کے زخمی دل پر ایک بڑا مرہم لگا دیا۔ مگر آپ کا
طرزِ عمل اتنا غیر متعلق اور جدا رہا کہ حکومتِ وقت کی طرف سے کوئی ذمہ داری
آپ پر ان اقدامات کی کبھی عائد نہ ہو سکی۔

آپ کی پوری زندگی کا دور آلِ محمدؐ اور ان کے شیعوں کے لیے پر آشوب رہا
یزید کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد حجاج ابن یوسف ثقفی کی ظالم حکومت اور چن چن کے
آلِ رسولؐ کے دوستوں کو قتل کرنا، حکومت کی طرف سے ہر ایک نقل و حرکت بلکہ
گفتگو پر بھی خفیہ مخبروں کا مقرر ہونا، اس صورت میں کہاں ممکن تھا کہ آپ ہدایتِ خلق
کے فرائض کو آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے مگر آپ کی خاموش سیرتِ زندگی
ہی دنیا کے لیے بہترین مثال تھی اور اپنی اس خاموش زندگی سے آپ دنیا کو
رسول اللہؐ کے طرزِ عمل سے روشناس بنا رہے تھے۔

مشاغلِ زندگی

واقعۂ کربلا کے بعد ۳۴ برس امام زین العابدینؑ نے انتہائی
ناگوار حالات میں بڑے صبر و ضبط اور استقلال
سے گزارے۔ اس تمام مدت میں آپ دنیا کے شور و شر سے علیحدہ صرف دو مشغلوں

میں رات دن بسر کرتے تھے۔ ایک عبادت خدا دوسرے اپنے باپ پر گریہ۔ یہی آپ کی مجلسیں تھیں جو زندگی بھر جاری رہیں۔ آپ جتنا اپنے والد بزرگوار کے مصائب کو یاد کر کے روئے ہیں دنیا میں کسی نے اتنا گریہ نہیں کیا۔ ہر ہر وقت پر آپ کو حسینؑ کی مصیبت یاد آتی تھی جب کھانا سامنے آتا تھا تب روتے تھے جب پانی سامنے آتا تھا تب روتے تھے۔ حسینؑ کی بھوک و پیاس یاد آجاتی تھی تو اکثر اس شدت سے گریہ وزاری فرماتے تھے اور اتنی دیر تک رونے میں مصروف رہتے تھے کہ گھر کے دوسرے لوگ گھبرا جاتے تھے۔ اور انہیں آپ کی زندگی کے لیے خطرہ محسوس ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آخر کب تک روئیے گا تو فرمایا کہ یعقوبؑ نبی کے بارہ بیٹے تھے ایک فرزند غائب ہو گیا تو وہ اس قدر روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں میرے سامنے تو اٹھارہ عزیز و اقارب جن کا مثل و نظیر دنیا کے پردہ پر نہ تھا قتل ہو گئے ہیں میں کیسے نہ روؤں۔

یوں تو یہ رونا بالکل فطری تاثرات کی تحریک سے تھا مگر اس کے ضمن میں ایک نہایت پر امن طریقہ سے حسینؑ کی مظلومیت اور شہادت کا تذکرہ زندہ رہا اور زین العابدینؑ کے غیر معمولی گریہ کے چرچے کے ساتھ شہادت حسینؑ کے واقعات کا تذکرہ فطری طور سے لوگوں کی زبانوں پر آتا رہا جو دوسری صورت میں اس وقت حکومت وقت کے مصالح کے خلاف ہونے کی بناء پر ممنوع قرار پا جاتا۔

دوسری مرتبہ گرفتاری

اتنی پر امن زندگی کے باوجود حکومت شام کو اپنے مقاصد میں حضرت کی ذات سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا اور عبد الملک ابن مروان نے اپنی حکومت کے زمانے میں آپ کو گرفتار کرا کے مدینہ سے شام کی طرف بلوایا اور دو تین دن آپ دمشق میں قید بھی رہے مگر خدا کی قدرت مخفی

یا آپ کی روحانیت کا اعجاز جس سے عبدالملک خود پشیمان ہوا اور مجبوراً حضرت کو مدینہ واپس ہو جانے دیا۔

اخلاق و کمالات

پیغمبر خدا کی مبارک نسل کی یہ خصوصیت تھی کہ بارہ فرد یکے بعد دیگرے ایک ہی طرح کے انسانی کمالات اور بہترین اخلاق و اوصاف کی حامل ہوتی رہیں جن میں سے ہر ایک اپنے وقت میں نوع انسانی کے لیے بہترین نمونہ تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سید سجادؑ تھے۔ جو اخلاق و اوصاف میں اپنے بزرگوں کے یادگار تھے اگر ایک طرف صبر و برداشت کا جوہر وہ تھا جو کربلا کے آئینہ میں نظر آیا تو دوسری طرف حلم اور عفو کی صفت آپ کی انتہائی درجہ پر تھی۔ آپ نے ان موقعوں پر اپنے خلاف سخت کلامی کرنے والوں سے جس طرح کی گفتگو فرمائی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا حلم اس طرح کا نہ تھا جیسے کوئی کمزور نفس والا انسان ڈر کر اپنے کو مجبور سمجھ کر تحمل سے کام لے بلکہ آپ عفو اور درگذر کی فضیلت پر زور دیتے ہوئے اپنے عمل سے اس کی مثال پیش کرتے تھے۔ ایک شخص نے بڑی سخت کلامی کی اور بہت سے غلط الزامات آپ پر آپ کے منہ پر عائد کیے حضرتؑ نے فرمایا جو کچھ تم نے کہا اگر وہ صحیح ہے تو خدا مجھے معاف کرے اور اگر غلط ہے تو خدا تمھیں معاف کر دے۔ اس بلند اخلاقی کے مظاہرے کا ایسا اثر پڑا کہ مخالف نے سر جھکا دیا اور کہا حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ غلط ہی تھا ایسے ہی دوسرے موقع پر ایک شخص نے آپ کی شان میں بہت ہی نازیبا کوئی لفظ استعمال کی حضرت نے اس طرح بے توجہی فرمائی کہ جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے پکار کے کہا۔ "اِیَّاکَ اَعْنِیْ" یعنی میں آپ ہی کو کہہ رہا ہوں۔ حضرتؑ نے فرمایا عَنْکَ اُعْرِضُ۔ ہاں میں تم ہی سے اعراض یعنی بے توجہی کر رہا ہوں۔ یہ اشارہ تھا اس حکم قرآن کی طرف کہ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ یعنی عفو کو اختیار کرو اچھے کاموں کی ہدایت

کرو اور جاہلوں سے بے توجہی اختیار کرو۔[۱۴]

ہشام ابن اسمٰعیل ایک شخص تھا جس سے حضرت کی نسبت کچھ ناگوار باتیں سرزد ہوئی تھیں یہ خبر بنی اُمیہ کے نیک بادشاہ عمر ابن عبدالعزیز کو پہنچی۔ اس نے حضرت کو لکھا کہ میں اس شخص کو سزا دوں گا۔ حضرت نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اُس کو کوئی نقصان پہنچے۔

فیاضی اور خدمت خلق کا جذبہ آپ کو ایسا تھا کہ راتوں کو غلہ اور روٹیاں اپنی پشت پر رکھ کے غریبوں کے گھروں پر لے جاتے تھے اور تقسیم کرتے تھے بہت سے لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ کہاں سے پاتے ہیں اور کون ان تک پہنچاتا ہے جب حضرت کی وفات ہوئی اس وقت انھیں پتہ چلا کہ یہ امام زین العابدینؑ تھے۔ عمل کی ان خوبیوں کے ساتھ علمی کمال بھی آپ کا ایسا تھا جو دشمنوں کو بھی سر جھکانے پر مجبور کرتا تھا اور ان کو اقرار تھا کہ آپ کے زمانے میں فقہ اور علم دین کا کوئی عالم آپ سے بڑھ کر نہیں۔ ان تمام ذاتی بلندیوں کے ساتھ آپ دنیا کو یہ سبق بھی دیتے تھے کہ بلند خاندان سے ہونے پر ناز نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ آپ جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لیجاتے تھے تو اپنا نام و نسب لوگوں کو نہ بتلاتے تھے۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں اپنے نسب کا سلسلہ تو پیغمبر خدا تک ملاؤں اور ان کے صفات مجھ میں نہ پائے جائیں۔

عبادت

آپ کی مخصوص صفت جس سے آپ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ مشہور ہوئے وہ عبادت ہے۔ باوجودیکہ آپ کربلا کے لیے بڑے حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے باپ بھائیوں اور عزیزوں کے دردناک قتل کے مناظر برابر آپ کی آنکھوں میں پھرا کرتے تھے اس حالت میں کسی دوسرے خیال کا ذہن پر غالب آنا عام انسانی فطرت کے لحاظ سے بہت مشکل ہے۔ مگر باپ کے اس غم و صدمہ نے جس نے عمر بھر سید سجادؑ کو رلایا اگر کوئی چیز غالب آتی تو وہ خوف خدا اور عبادت میں محویت تھی۔ یہاں تک کہ جس وقت وضو کے لیے پانی سامنے آتا تھا اور نماز کا ارادہ فرماتے تھے اس وقت

آپ کے تصورات کی دنیا بدل جاتی تھی چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور جسم میں لرزہ پڑ جاتا تھا کسی کی سبب پوچھتا تھا تو فرماتے تھے کہ خیال تو کرو مجھے کس شہنشاہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔
ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر ایسا ہوا کہ احرام باندھتے وقت لبیک (حاضر ہوں) کہنا چاہا تو رنگ چہرہ کا اڑ گیا اور تمام جسم میں لرزہ پڑ گیا اور کسی طرح لبیک نہ کہا گیا لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا میں سوچتا ہوں کہ شاید میں لبیک کہوں اور اس بارگاہ سے یہ آواز آئے کہ لا لبیک (حاضری کی اجازت نہیں) یہ فرما کر اتنا روئے کہ غش آ گیا۔ اس دور میں کہ حب دنیا کے دل پر دنیوی بادشاہوں کی عظمت کا اثر تھا اور خالق کو بالکل بھول چکی تھی سید سجاد ہی تھے جن کی زندگی خالق کی عظمت کا احساس پیدا کرتی تھی۔

صحیفہ سجادیہ یا زبور آل محمدؐ حضرت امام زین العابدینؑ کو زمانہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اپنے دادا علی ابن ابی طالبؑ کی طرح خطبوں (تقریروں) کے ذریعہ سے دنیا کو علوم و معارف اور الہیات وغیرہ کی تعلیم دیں نہ ان کے لیے اس کا موقعہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے امام محمد باقرؑ یا اپنے پوتے امام جعفر صادقؑ کی طرح شاگردوں کے مجمع میں علمی و دینی مسائل حل کریں۔ اور دنیا کو اچھی باتوں کی تعلیم دیں۔ یہ سب باتیں وہ تھیں جو اس وقت کی فضا کے لحاظ سے غیر ممکن تھیں۔
اس لیے امام زین العابدینؑ نے ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا جو بالکل پرامن تھا۔ اور جسے روکنے کا دنیا کی کسی طاقت کو کوئی بہانہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ تمام دنیا والوں سے منہ موڑ کر وہ اپنے خالق سے مناجات کرتے اور دعائیں پڑھتے تھے۔ مگر یہ مناجاتیں اور دعائیں کیا تھیں؟ الہیات کا خزانہ معارف اور حقائق کا گنجینہ خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق کا صحیح آئینہ۔ ان دعاؤں کا مجموعہ صحیفہ کاملہ صحیفہ سجادیہ اور زبور آل محمدؐ کے ناموں سے اس وقت تک موجود ہے۔
اس میں انسان کو سب کچھ وہ مل جاتا ہے جو اچھے بڑے بڑے خطبوں اور تقریروں میں شاید اتنی پر تاثیر انداز سے نہ ملتا۔

وفات افسوس ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ کی یہ خاموش زندگی بھی ظالم حکومت کو ناگوار ہوئی اور ولید بن عبد الملک اموی بادشاہ شام نے آپ کو زہر دلوا دیا اور ۲۵ محرم ۹۵ھ میں وفات ہو گئی۔ مدینہ کے مقام پر امام محمد باقرؑ نے اپنے مقدس باپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام لیا اور جنت البقیع میں حضرت امام حسنؑ کے پہلو میں دفن کیا۔

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

امامیہ مشن لکھنؤ

دوسرا ایڈیشن

(مطبوعہ)
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

(رسالہ نمبر)
امامیہ مشن لکھنؤ

از سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

(تعارف)

(دوسرا اڈیشن)

پانچویں امام، اس رسالے میں امام محمد باقر علیہ السلام کے مختصر سوانح حیات ہیں۔ جس میں ضروری حالات تقریباً سب آگئے ہیں۔ یہ اپنے سلسلے کی تیسری کتاب ہے امام اوّل اور امام چہارم کی سوانح عمریاں شائع کی جاچکی ہیں۔ بقیہ نو اماموں کے سوانح حیات اسی طرح پر شائع کیے جائیں گے یہ رسالے ناواقف بڑوں اور بچوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ افراد قوم کو چاہیے کہ ان رسالوں کو زیادہ تعداد میں خرید فرماکر اپنے یہاں کی مجلسوں میں تقسیم فرمائیں۔

خادم مشن
سید آفاق حسین رضوی
آنریری سکریٹری

۱۰ر فروری ۱۹۴۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام محمد باقرؑ

امام کے معنی پیشوا کے ہیں اور سچا پیشوا وہی ہو سکتا ہے جس کے پیچھے چل کر انسان نجات کا حق دار بن سکے اور نجات کا حق دار ایسے ہی انسان کی پیروی سے ہو سکتا ہے جو خود زندگی کے ہر شعبہ میں اس بلند معیار پر پہنچا ہوا ہو جو انسان کی بہتری کے لیے خالق انسان کو مد نظر ہے۔ یہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک گھرانے کی خصوصیت تھی کہ اس گھرانے میں پیغمبر کے بعد لگاتار بارہ ایسے کامل فرد پیدا ہوتے رہے جن میں سے ہر ایک بلند ترین انسانی اوصاف کا مرقع تھا اور ہر ایک خلق خدا کی راہنمائی اور پیشوائی کے منصب پر خدا کی طرف سے پہنچا ہوا۔ یہ بارہ امام ہیں جن میں سے پانچویں شخصیت کا تذکرہ اس رسالہ میں پیش نظر ہے۔

نام و نسب

پانچویں امام کا نام اپنے جد بزرگوار حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر محمد تھا اور باقر لقب۔ اسی وجہ سے امام محمد باقرؑ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بارہ اماموں میں سے یہ آپ ہی کو خصوصیت تھی کہ آپ کا سلسلۂ نسب ماں اور باپ دونوں طرف سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ آپ حضرت امام زین العابدینؑ چوتھے امام تھے جن کے حالات سید سجادؑ کے نام سے اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ امام زین العابدینؑ فرزند تھے سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے جو حضرت رسول خدا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھوٹے نواسے تھے۔ اور امام

محمد باقر علیہ السلام کی والدہ اُم عبداللہ فاطمہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں جو حضرت رسول صلعم کے بڑے نواسے تھے۔ اس طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام رسول صلعم کے بلند کمالات اور علیؑ اور فاطمہ ع کی نسل کے پاک خصوصیات کے باپ اور ماں دونوں کی جانب سے وارث ہوئے۔

ولادت آپ کی ولادت روز جمعہ یکم رجب ۵۷ھ میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب امام حسن علیہ السلام کی وفات کو سات برس ہو چکے تھے اور امام حسین علیہ السلام مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وقت کی رفتار تیزی کے ساتھ واقعۂ کربلا کے اسباب کو فراہم کر رہی تھی۔ زمانہ آلِ رسول ص اور شیعیانِ اہلِ بیت کے لیے پُر آشوب تھا۔ چُن چُن کر محبانِ علیؑ گرفتار کیے جا رہے تھے۔ تلوار کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے یا سولیوں پر چڑھائے جا رہے تھے۔ اُس وقت اس مولود کی ولادت گویا کربلا کے جہاد میں شریک ہونے والے سلسلہ میں ایک کڑی کی تکمیل تھی۔

واقعۂ کربلا تین برس محمد باقر علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت امام حسین علیہ السلام کے سایہ میں رہے۔ جب آپ کا سن پورے تین برس کا ہوا تو امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے سفر کیا۔ اُس کمسنی میں محمد باقر علیہ السلام بھی راستہ کی تکلیفیں سہنے میں اپنے بزرگوں کے شریک رہے۔ امام حسین علیہ السلام نے مکہ میں پناہ لی۔ پھر کوفہ کا سفر اختیار کیا اور پھر کربلا پہنچے۔ ساتویں محرم سے جب پانی بند ہو گیا تو یقیناً محمد باقرؑ نے بھی تین دن پیاس کی تکلیف برداشت کی۔ یہ خالق کے منشا کی ایک تکمیل تھی کہ جو روزِ عاشور میدانِ قربانی میں [illegible] لائے گئے تو [illegible]

چھوٹے سن کا بچہ علی اصغرؑ جیسا تیرِ ستم کا نشانہ ہو سکتا تھا تو محمد باقرؑ کا بھی قربان گاہ شہادت
میں لانا ممکن تھا۔ مگر سلسلۂ امامت کا دنیا میں قائم رہنا نظام کائنات کے برقرار رہنے کے
لیے ضروری اور اہم تھا۔ اس لیے منظورِ الٰہی یہ تھا کہ محمد باقرؑ کربلا کے جہاد میں اسی
طرح شریک ہوں جس طرح ان کے والد بزرگوار سید سجاد زین العابدین علیہ السلام
شریک ہوئے۔ عاشور کو دن بھر عزیزوں کے لاشے پر لاشے آتے دیکھنا۔
بی بیوں میں کہرام۔ بچوں میں تہلکہ۔ امام حسین علیہ السلام کا وداع ہونا اور ننھی
سی جان علی اصغرؑ تک کا جھولے سے جدا ہو کر میدان میں جانا اور پھر واپس
نہ آنا امامؑ کے باوفا گھوڑے کا درِ خیمہ پر خالی زین کے ساتھ آنا اور پھر
خیمۂ عصمت میں ایک قیامت کا برپا ہونا یہ سب مناظر محمد باقرؑ کی آنکھوں کے
سامنے آئے۔ اور پھر بعد عصر خیموں میں آگ کا لگنا اسباب کا لوٹا جانا۔ بی بیوں کے
سروں سے چادروں کا اتارا جانا اور آگ کے شعلوں سے بچوں کا گھبرا کر سراسیمہ و
مضطرب ادھر ادھر پھرنا اس عالم میں محمد باقرؑ کے ننھے سے دل پر کیا گذری اور کیا تاثرات
ان کے دل پر قائم رہ گئے۔ اس کا اندازہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔

گیارہ محرم کے بعد ماں اور پھوپھی دادی اور نانی اور تمام خاندان کے بزرگوں کو دشمن
کی قید میں اسیر دیکھا۔ یقیناً اگر سکینہؑ کا بازو رسی میں بندھ سکتا تھا تو یقین کیا جا سکتا ہے
کہ محمد باقرؑ کا گلا بھی ریسمانِ ظلم سے ضرور باندھا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام اور پھر اس
کے بعد مدینہ کی واپسی ان تمام منازل میں نہ جانے کتنے صدمے تھے جو محمد باقرؑ کے ننھے سے دل کو
اٹھانا پڑے اور کتنے غم و الم کے نقش تھے جو دل پر ایسے بیٹھے کہ آئندہ زندگی میں ہمیشہ برقرار رہے۔

تربیت واقعۂ کربلا کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی دنیا
کی کشمکشوں اور آویزشوں سے بالکل الگ نہایت سکون اور

سکوت کی زندگی تھی۔ اہل دنیا سے میل جول بالکل ترک کبھی محراب عبادت اور کبھی باپ کا ماتم۔ ان ہی دو مشغلوں میں تمام اوقات صرف ہوتے تھے۔ یہ ہی زمانہ وہ تھا جس میں امام محمد باقر علیہ السّلام نے نشوونما پائی۔ سنہ ۵۷ھ سے ۹۵ھ تک ۳۴ برس اپنے مقدس باپ کی سیرت زندگی کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور اپنے فطری اور خداداد ذاتی کمالات کے ساتھ ان تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے رہے جو انھیں اپنے والد بزرگوار کی زندگی کے آئینہ میں برابر نظر آتی رہیں۔

باپ کی وفات اور امامت کی ذمہ داریاں

حضرت امام محمد باقرؑ بھرپور جوانی کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ایک ساتھ جسمانی و روحانی کمال کے بلند ترین نقطہ پر تھے۔ اور ۳۸ برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات ہوئی حضرت نے اپنے وقت وفات ایک صندوق جس میں اہل بیت کے مخصوص علوم کی کتابیں تھیں۔ امام محمد باقرؑ کے سپرد کیا۔ نیز اپنی تمام اولاد کو جمع کر کے ان سب کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری اپنے فرزند محمد باقر علیہ السلام پر قرار دی اور ضروری وصایا فرمائے۔ اس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں حضرت امام محمد باقرؑ پر آئیں۔ آپ سلسلۂ اہل بیت کے پانچویں امام ہوئے جو رسولِ خدا کے برحق جانشین تھے۔

اس دور کے خصوصیات

یہ زمانہ وہ تھا جب بنی امیہ کی سلطنت اپنی مادی طاقت کے لحاظ سے بڑھاپے کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ بنی ہاشم پر ظلم و ستم اور خصوصًا کربلا کے واقعہ نے بہت حد تک دنیا کی آنکھوں کو کھول دیا تھا اور جب یزید خود اپنے مختصر زمانہ حیات ہی میں جو واقعہ کربلا کے بعد ہوا اپنے کیے پر پشیمان

ہو چکا تھا اور اس کے بُرے نتائج کو محسوس کر چکا تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ
اپنے باپ اور دادا کے افعال سے کھلم کھلا اظہار بیزاری کر کے سلطنت سے دست بردار
ہو گیا تھا تو بعد کے سلاطین کو کہاں تک ان مظالم کے مہلک نتائج کا احساس نہ ہوتا جبکہ
اس وقت جماعت توابین کا جہاد مختار اور ان کے ہمراہیوں کے خون حسینؑ کا بدلہ لینے
میں اقدامات اور نہ جانے کتنے واقعات سامنے آ چکے تھے جن سے سلطنت شام کی
بنیادیں ہل گئیں تھیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانۂ امامت کو
حکومت کے ظلم و تشدد کی گرفت سے کچھ آزادی نصیب ہوئی۔ آپ کو خلق خدا
کی اصلاح و ہدایت کا کچھ زیادہ موقعہ مل سکا۔

عزائے امام حسینؑ میں انہماک

آپ واقعہ کربلا کو اپنی آنکھ سے دیکھے ہوئے تھے۔ پھر اپنے باپ
کی تمام زندگی کا جو امام مظلوم کے غم میں رونے میں بسر ہوئی مطالعہ کر چکے
تھے۔ یہ احساس بھی نہایت تکلیف دہ تھا کہ ان کے والد بزرگوار باوجود
اتنے غم و رنج اور گریہ و زاری کے ایسا موقعہ نہ پا سکے کہ دوسروں
کو امام حسین علیہ السلام کا ماتم برپا کرنے کی دعوت دیتے۔ اس کا نتیجہ
تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو اس میں خاص اہتمام پیدا ہوا۔ آپ
مجالس کی بنا فرماتے تھے اور کمیت بن زید اسدی جو آپ کے زمانہ
کے بڑے شاعر تھے ان کو بلا کر مراثی امام حسین علیہ السلام پڑھواتے تھے
اور سنتے تھے۔ یہی وہ ابتدا تھی جسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام
اور اس کے بعد پھر حضرت امام رضا علیہ السلام کے زمانہ میں بہت فروغ
حاصل ہوا۔

علمی تبحر

دریا کا پانی بند کے باندھ دیئے جانے سے جب کچھ عرصہ تک ٹھہر جائے اور پھر کسی وجہ سے وہ بند ٹوٹ جائے تو پانی بڑی قوت اور جوش و خروش کے ساتھ بہتا ہوا محسوس ہوگا۔ ائمہ اہل بیت میں سے ہر ایک کے سینہ میں ایک ہی دریا تھا علم کا جو موجزن تھا۔ مگر اثرات ظلم و تشدد کی وجہ سے اس دریا کو پیاسوں کی سیرابی کرنے کے لئے بہنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں جب تشدد کا شکنجہ ذرا ڈھیلا ہوا تو علوم اہل بیت کا دریا پوری طاقت کے ساتھ امنڈ آیا اور ہزاروں پیاسوں کو سیراب کرتا ہوا شریعت حقہ اور احکام الٰہی کی کھیتوں کو سرسبز بناتا ہوا دنیا میں پھیل گیا۔ اس علمی تبحر اور وسعت معلومات کے مظاہرے کے نتیجے میں آپ کا لقب باقرؑ مشہور ہوا۔ اس لفظ کے معنی ہیں "اندرونی باتوں کے ظاہر کرنے والے" چونکہ آپ نے اپنے علم سے بہت سے پوشیدہ مطالب کو ظاہر کیا اس لئے تمام مسلمان آپ کو باقرؑ کے نام سے یاد کرنے لگے۔ آپ سے علوم اہل بیت حاصل کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ بہت سے ایسے افراد بھی جو عقیدتاً ائمہ معصومینؑ سے وابستہ نہ تھے اور جنہیں جماعت اہل سنت اپنے محدثین میں بلند درجہ پر سمجھتی ہے۔ وہ بھی علمی فیوض حاصل کرنے امام محمد باقر علیہ السلام کی ڈیوڑھی پر آتے تھے۔ جیسے زہری۔ امام اوزاعی اور عطاء ابن جریح۔ قاضی حفص ابن غیاث وغیرہ یہ سب امام محمد باقرؑ کے شاگردوں میں منسوب ہیں۔

علوم اہل بیت کی اشاعت

حضرتؑ کے زمانہ میں علوم اہل بیت کے تحفظ کا اہتمام ہوا۔ اور حضرت

کے شاگردوں نے ان افادات سے جو انہیں حضرت امام محمد باقرؑ سے حاصل ہوئے مختلف علوم و فنون اور مذہب کے شعبوں پر کتابیں تصنیف کیں۔ ذیل میں حضرت کے کچھ شاگردوں کا ذکر اور ان کی تصنیفات کا نام درج کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اسلامی دنیا میں علم و مذہب کی کتنی ترقی کی۔

(۱) ابان ابن تغلب۔ یہ علم قرأت اور لغت کے امام مانے گئے ہیں۔ سب سے پہلے کتاب غریب القرآن یعنی قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح انھوں نے تحریر کی تھی۔ سنہ ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابو جعفر محمد ابن حسن ابن ابی سارہ رواسی۔ علم قرأت، نحو اور تفسیر کے مشہور عالم تھے۔ کتاب الفیصل، معانی القرآن وغیرہ پانچ [illegible] مصنف ہیں۔ سنہ [illegible]ھ میں وفات پائی۔

(۳) عبداللہ ابن میمون اسود القداح۔ ان کی تصنیفات سے ایک کتاب مبعث نبی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور تاریخ زندگی میں، ایک اور کتاب حالات جنت و نار میں تھی۔ سنہ ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

(۴) عطیہ ابن سعید عوفی۔ پانچ جلدوں میں تفسیر قرآن لکھی۔ سنہ ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

(۵) اسمٰعیل ابن عبدالرحمٰن السدی الکبیر۔ یہ مشہور مفسر قرآن ہیں جن کے حوالے تمام اسلامی مفسرین نے سدی کے نام سے دیے ہیں۔ سنہ ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔

(۶) جابر بن یزید جعفی۔ انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پچاس ہزار حدیثیں سن کر یاد کیں اور ایک روایت میں ستر ہزار کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس کا ذکر صحاح ستہ میں سے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ تفسیر۔ فقہ اور حدیث میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ سنہ ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔

(۷) عمار ابن معاویہ دہنی۔ فقہ میں ایک کتاب تصنیف کی سنہ ۱۳۳ھ میں وفات پائی۔

(۸) سالم ابن ابی حفصہ ابو یونس کوفی۔ فقہ میں ایک کتاب لکھی وفات سنہ ۱۳۷ھ۔

(۹) عبد المومن ابن قاسم ابو عبد اللہ انصاری۔ یہ بھی فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ سنہ ۱۴۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۰) ابو حمزہ ثمالی۔ تفسیر قرآن میں ایک کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ کتاب النوادر اور کتاب الزہد بھی ان کے تصانیف میں سے ہیں۔ سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۱) زرارہ ابن اعین۔ بڑے بزرگ مرتبہ بلند عالم تھے۔ ان کی علم کلام اور فقہ اور حدیث میں بہت سی کتابیں ہیں۔ وفات سنہ ۱۵۰ھ۔

(۱۲) محمد ابن مسلم۔ یہ بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے تیس ہزار حدیثیں سنیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب تھی چہار صد مسئلہ در ابواب حلال و حرام۔ وفات سنہ ۱۵۰ھ۔

(۱۳) یحییٰ ابن قاسم ابو بصیر اسدی۔ جلیل المرتبہ بزرگ تھے۔ کتاب مناسک حج۔ کتاب یوم و لیلہ تصنیف کی۔ سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) اسحٰق ابن عمار - فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

(۱۵) اسمٰعیل ابن جابر خثعمی کوفی - احادیث کی کئی کتابیں تصنیف کیں اور ایک کتاب فقہ میں تصنیف کی۔

(۱۶) اسمٰعیل ابن عبد الخالق - جلیل القدر فقیہ تھے ان کی تصنیف سے بھی ایک کتاب تھی۔

(۱۷) برید ابن معاویہ العجلی - فقہ میں ایک کتاب لکھی۔

(۱۸) حارث ابن مغیرہ - بہت سے مسائل فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

(۱۹) حذیفہ ابن منصور خزاعی - ان کی بھی ایک کتاب فقہ میں تھی۔

(۲۰) حسن ابن السری الکاتب - ایک کتاب تصنیف کی۔

(۲۱) حسین ابن ثور ابن ابی فاختہ - کتاب النوادر تحریر کی۔

(۲۲) حسین ابن حماد عبدی کوفی - ایک کتاب تصنیف کیا۔

(۲۳) حسین ابن مصعب بجلی - ان کی بھی ایک کتاب تھی۔

(۲۴) حماد ابن ابی طلحہ - ایک کتاب تحریر کی۔

(۲۵) حمزہ ابن حمران ابن اعین - زرارہ کے بھتیجے تھے۔ اور ایک کتاب کے مصنف تھے۔

یہ چند نام ہیں ان کثیر علماء و فقہاء و محدثین میں سے جنہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے علوم اہل بیت کو حاصل کر کے کتابوں کی صورت میں محفوظ کیا۔ اور پھر اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں جو سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں یہی وہ سرمایہ تھا جس سے بعد میں کافی - من لا یحضرہ - تہذیب اور استبصار اسی

بڑے حدیث کے خزانے جمع ہوسکے۔ اور جن پر شیعیت کا آسمان دورہ کرتا رہا ہے۔

اخلاق و اوصاف

آپ کے اخلاق وہ تھے کہ دشمن بھی قائل تھے۔ چنانچہ ایک شخص اہل شام میں سے مدینہ میں قیام رکھتا تھا وہ اکثر امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اور اس کا بیان تھا کہ مجھے اس گھرانے سے ہرگز کوئی خلوص و محبت نہیں مگر آپ کے اخلاق کی کشش اور فصاحت وہ ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے پاس آنے اور بیٹھنے پر مجبور ہوں۔

امور سلطنت میں مشورہ

سلطنت اسلامیہ حقیقت میں ان اہلبیت رسول کا حق تھی مگر دنیا والوں نے مادی اقتدار کے آگے سر جھکایا اور ان حضرات کو گوشہ نشینی اختیار فرمانا پڑی عام افراد انسان کی ذہنیت کے مطابق اس صورت میں اگر حکومت وقت کسی وقت ان حضرات کی امداد کی ضرورت محسوس کرتی تو صاف طور پر انکار میں جواب دیا جا سکتا تھا مگر ان حضرات کے پیش نظر عالی ظرفی کا وہ معیار تھا جس تک عام لوگ پہنچے ہوئے نہیں ہوتے۔ جس طرح امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے سخت موقعوں پر حکومت وقت کو مفید مشورے دینے سے دریغ نہیں کیا اسی طرح اس سلسلہ کے تمام حضرات نے اپنے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کیا۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے

زمانہ میں بھی ایسی صورت پیش آئی۔ واقعہ یہ تھا کہ حکومت اسلام کی طرف سے اس وقت تک کوئی خاص سکہ نہیں بنایا گیا تھا۔ بلکہ رومی سلطنت کے سکے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھے۔ ولید ابن عبد الملک کے زمانہ میں سلطنت شام اور سلطان روم کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ رومی سلطنت نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے سکوں پر پیغمبر اسلام کی شان کے خلاف کچھ الفاظ نقش کرا دے گی۔ اس سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی۔ ولید نے ایک بہت بڑا جلسہ مشاورت کے لیے منعقد کیا جس میں عالم اسلام کے ممتاز افراد شریک تھے۔ اس جلسہ میں امام محمد باقر علیہ السلام بھی شریک ہوئے اور آپ نے یہ رائے دی کہ مسلمانوں کو خود اپنا سکہ ڈھالنا چاہیئے جس میں ایک طرف لا الٰہ الا اللہ اور دوسری طرف محمد رسول اللہ نقش ہو۔ امام کی اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور اسلامی سکہ اسی طور پر تیار کیا گیا۔

سلطنت بنی امیہ کی طرف سے مزاحمت باوجودیکہ امام محمد باقر علیہ السلام معاملات ملکی میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور دخل دیا بھی تو سلطنت کی خواہش پر وقار اسلامی کے برقرار رکھنے کے لیے۔ مگر آپ کی خاموش زندگی اور خالص علمی اور روحانی مرجعیت بھی سلطنت وقت کو گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ ہشام ابن عبد الملک نے مدینہ کے حاکم کو خط لکھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو ان کے فرزند حضرت جعفر صادق کے ساتھ دمشق بھیج دیا جائے۔ اس کو منظور یہ تھا کہ حضرت کی عزت و وقار لوگوں کے خیال میں کم ہو جائے ...

چنانچہ جب یہ حضرات دمشق پہنچے تو تین دن تک ہشام نے ملاقات کا موقع نہیں دیا۔
چوتھے دن دربار میں بلا بھیجا۔ ایک ایسے موقع پر کہ جب وہ تخت شاہی پر بیٹھا تھا اور لشکر
داہنے اور بائیں ہتھیار لگائے صف بستہ کھڑا ہوا تھا۔ اور وسط دربار میں ایک نشانہ
تیراندازی کا مقرر کیا گیا تھا اور رؤسائے سلطنت اس کے سامنے شرط باندھ کر
تیر لگاتے تھے۔ امام علیہ السلام کے پہنچنے پر انتہائی جرأت اور جسارت کیا تھا اس نے
خواہش کی کہ آپ بھی ان لوگوں کے ہمراہ تیر لگائیں۔ ہر چند حضرت نے معذرت فرمائی
مگر یہ عذر قبول نہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آل محمدؐ طویل مدت سے گوشہ نشینی کی
زندگی بسر کر رہے ہیں ان کو جنگ کے فنون سے کیا واسطہ۔ اور اس طرح
منظور یہ تھا کہ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے۔ مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ ان میں
سے ہر ایک فرد کے بازو میں علی علیہ السلام کی قوت اور دل میں امام حسین
علیہ السلام کی طاقت موجود ہے۔ وہ حکم الٰہی اور فرض کا احساس ہے جس کی
وجہ سے یہ حضرات ایک سکون اور سکوت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ یہ ہوا کہ
جب مجبور ہو کر حضرت نے تیر و کمان ہاتھ میں لیا اور چند تیر پے در پے ایک
ہی نشانہ پر بالکل ایک ہی نقطہ پر لگائے تو مجمع تعجب اور حیرت میں غرق
ہو گیا اور ہر طرف سے تعریفیں ہونے لگیں۔ ہشام کو اپنے طرز عمل پر پشیمان
ہونا پڑا۔ اس کے بعد حضرت سے مسئلہ امامت اور فضائل اہل بیتؑ پر
گفتگو ہوئی جس کے بعد اس کو یہ احساس ہوا کہ امام علیہ السلام کا دمشق
میں قیام کہیں عام خلقت کے دل میں اہل بیتؑ کی عظمت قائم کر دینے
کا سبب نہ ہو۔ اس لیے اس نے آپ کو مدینہ واپس جانے کی اجازت

دی مگر دل میں امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ عداوت میں اور اضافہ ہو گیا۔

وفات سلطنت شام کو جتنا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی جلالت اور بزرگی کا اندازہ زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی آپ کا وجود ان کے لیے ناقابل برداشت محسوس ہوتا رہا۔ آخر آپ کو اس خاموش زہر کے حربہ سے جو اکثر سلطنت بنی امیہ کی طرف سے کام میں لایا جاتا رہا تھا شہید کرنے کی تدبیر کر لی گئی۔ وہ ایک زین کا تحفہ تھا جس میں خاص تدبیروں سے زہر پوشیدہ کیا گیا تھا اور جب حضرت اس زین پر سوار ہوئے تو زہر جسم میں سرایت کر گیا۔ چند روز کرب و تکلیف میں بستر بیماری پر گذرے اور آخر ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ میں ۵۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کو حسب وصیت تین کپڑوں کا کفن دیا گیا جن میں سے ایک وہ یمنی چادر تھی جسے اوڑھ کر آپ روز جمعہ نماز پڑھتے تھے اور ایک وہ پیراہن تھا جسے آپ ہمیشہ پہنے رہتے تھے اور جنت البقیع میں اسی قبہ میں کہ جہاں حضرت امام حسن علیہ السلام اور امام زین العابدین علیہ السلام دفن ہو چکے تھے حضرت بھی دفن کئے گئے۔
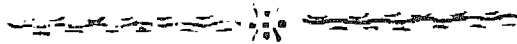
پبلشر

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
یوسفی پریس لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۱
امامیہ مشن لکھنؤ

صادق آل محمد

سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت ۲ر دو آنے فی نسخہ — محصول ڈاک [illegible]

تعارف

ہمارے چھٹے امام، امام جعفر صادق علیہ السلام کی مختصر سوانح عمری "صادق آلِ محمدؐ" کے نام سے دنیائے علم کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ اختصار کی انتہائی پابندی کے باوجود اس رسالے میں تمام ضروری حالات واضح طور پر آ گئے ہیں۔ یہ جامعیت جناب سید العلماء کے قلم معجز رقم کا نتیجہ ہے۔ ادارہ جناب مولانا کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

ائمہ معصومینؑ کے سوانح حیات مختصر شائع کرنے سے کئی فائدے پیش نظر ہیں۔ کم قیمت ہونے کی وجہ سے ہر شخص آسانی سے خرید سکے گا جس سے ان کی اشاعت کثرت سے ہو سکے گی، دوسرے ان کو پڑھنے کے لیے بہت ہی کم وقت درکار ہے اس لیے امکان ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر شخص ان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے تھوڑا سا وقت نکال سکے، تیسرے ہمارے بچے ان کو آسانی سے یاد کر سکیں گے۔ اب سارے قوم کو چاہیے کہ وہ ان سوانح عمریوں کو کثیر تعداد میں خرید فرما کر مفت تقسیم کرائیں۔ وہ اپنے یہاں کی مجلسوں میں تبرک کا بدل قرار دیں۔ ابھی آٹھ اماموں کے سوانح حیات شائع ہو رہے ہیں۔

یوں تو ان رسالوں کی قیمت ۲ دو آنے فی کاپی ہے، اگر سو سے زائد کے خریدار کو چھ پیسے اور پانچ سو ۵۰۰ سے زیادہ کے خریدار کو ایک آنہ فی کتاب کے حساب سے دی جائیں گی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی کتاب پانچ سو ۵۰۰ کی تعداد میں خریدی جائے، سب سوانح عمریاں ملا کر پانچ سو ۵۰۰ کی تعداد پوری کی جا سکتی ہے جن کی مجموعی قیمت صرف اکتیس ۳۱ روپے چار آنے ہوتی ہے۔ پانچ سو ۵۰۰ آدمیوں کو تبرک تقسیم کرنے میں اس سے کہیں زیادہ رقم صرف ہوگی اور یہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔ ایام عزا بالکل قریب آ گئے ہیں ان ائمہ طاہرینؑ کے سوانح حیات ضرور تقسیم فرمائیے۔

خادم ملت :- سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

۵ / نومبر ۱۹۴۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"جعفری باش گر خدا خواہی" خدا پرستی کا وہ راستہ جسے محمدؐ عربی نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ظلم و ستم کی آندھیوں سے شبہات و اوہام کی گرد میں اَٹ گیا تھا جب امام جعفر صادق علیہ السلام کو اتنا موقع مل سکا کہ وہ اُسے نمایاں اور صاف کر کے دوبارہ دنیا کی نگاہ کے سامنے پیش کریں۔ اس لیے اب یہ ملت "ملت جعفری" کہلائی اگرچہ اس کے قبل بھی آل رسولؐ میں سے ہر مقدس ہستی اسی تعلیم کی حفاظت کرتی رہی اور اسی لیے قربانیاں پیش ہوتی رہیں مگر سیاسی اقتدار کے شکنجوں نے زیادہ تر انہیں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا اور اسی لیے رسولؐ کے گھرانے کے مقدس تعلیمات جو نوع انسانی کے شیرازہ بندی کے ذمہ دار ہیں ہمارے ہاتھوں میں صادق آل محمدؐ ہی کے ذریعے سے پہنچے۔ آپ کے ارشادات اور آپ کی سیرت زندگی کے خد و خال سے نوع انسانی کا روشناس ہونا اس کی اخلاقی اور روحانی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے سوانح آل محمدؐ کے سلسلہ کی یہ آٹھویں کڑی حضرت صادق آل محمدؐ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالات میں پیش کی جا رہی ہے۔

نام و نسب | جعفر نام کنیت ابو عبد اللہ اور صادق لقب تھا۔ آپ حضرت امام محمد باقرؑ کے بیٹے حضرت امام زین العابدینؑ کے پوتے اور شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کے پڑپوتے تھے۔ سلسلہ عصمت کی آٹھویں کڑی اور ائمہ اہلبیتؑ میں سے چھٹے امام تھے۔ آپ کی والدہ حضرت محمد ابن ابی بکر کی پوتی ام فروہ تھیں۔ جن کے والد قاسم ابن محمد مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے تھے۔

ولادت

۸۳ھ میں ۱۷ ربیع الاول کو اپنے جد بزرگوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کی تاریخ میں آپ کی ولادت ہوئی اس وقت آپ کے دادا حضرت امام زین العابدینؑ بھی زندہ تھے آپ کے والد بزرگوار حضرت امام محمد باقرؑ کی عمر اس وقت چھبیس برس کی تھی۔ خاندان آلِ رسولؐ میں اس اضافہ کا انتہائی خوشی سے استقبال کیا گیا۔

نشوونما اور تربیت

بارہ برس آپ نے اپنے جد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؑ کے زیر سایہ تربیت پائی۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد سے پینتیس برس امام زین العابدین علیہ السلام کا مشغلہ سوائے عبادت الٰہی اور اپنے مظلوم باپ حضرت سید الشہداؑ کو رونے کے اور کچھ نہ تھا۔ واقعۂ کربلا کو ابھی صرف بائیس برس گزرے تھے، اس مدت میں کربلا کا عظیم الشان واقعہ اپنے اثرات کے لحاظ سے ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے آنکھ کھولی تو اسی غم و اندوہ کی فضا میں، شب و روز شہادت حسینؑ کا تذکرہ اور اس غم میں نوحہ و ماتم اور گریہ و بکا کی آوازوں نے ان کے دل و دماغ پر وہ اثر قائم کیا کہ جیسے وہ خود واقعہ کربلا میں موجود ہوں۔ پھر جب وہ یہ سنتے تھے کہ ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ بھی کم سنی ہی کے دور میں ہی اس جہاد میں شریک تھے تو ان کے دل کو یہ احساس بہت صدمہ پہنچاتا ہوگا کہ خاندان عصمت کے موجودہ افراد میں ایک میں ہی ہوں جو اس قابل فخر یادگار معرکہ ابتلا میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ اور عمر بھر امام جعفر صادق علیہ السلام نے جس جس طرح اپنے جد مظلوم امام حسین علیہ السلام کی یاد کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔

بارہ برس کی آپ کی عمر تھی جب ۹۵ھ میں امام زین العابدین علیہ السلام کا سایہ سر سے اٹھا۔ اس کے بعد انیس برس آپ نے اپنے والد ماجد حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

کے دامانِ تربیت میں گذارے۔ یہ وہ وقت تھا جب سیاست بنی امیہ کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف فیوضِ علمی حاصل کرنے کے لیے خلائق رجوع کر رہی تھی۔ اس وقت اپنے پدر بزرگوار کی مجلسِ درس میں حضرت جعفر صادقؑ ہی ایک وہ طالب علم تھے جو قدرت کی طرف سے علم کے سانچے میں ڈھال کر پیدا کیے گئے تھے۔ آپ سفر اور حضر دونوں میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ہشام ابن عبدالملک کی طلب پر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام جب دمشق تشریف لے گئے ہیں تو اس سفر میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام ساتھ تھے اس کا ذکر پانچویں امام کے حالات میں ہو چکا ہے۔

دورِ امامت

۱۱۴ھ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وفات ہوئی اب امامت کی ذمہ داریاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف عائد ہوئیں۔ اس وقت دمشق میں ہشام ابن عبدالملک کی سلطنت تھی۔ اس کے زمانۂ سلطنت میں ملک میں سیاسی خلفشار بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ مظالم بنی امیہ کے انتقام کا جذبہ تیز ہو رہا تھا۔ اور بنی فاطمہ میں سے متعدد افراد حکومت کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ہستی حضرت زید کی تھی۔ جو امام زین العابدین علیہ السلام کے بزرگ مرتبہ فرزند تھے۔ ان کی عبادت، زہد و تقویٰ کا بھی ملک عرب میں شہرہ تھا۔ مستند اور مسلّم حافظِ قرآن تھے۔ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ کر انہوں نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے یہ موقع نہایت نازک تھا۔ مظالم بنی امیہ سے نفرت میں ظاہر ہے کہ آپ زید کے ساتھ متفق تھے۔ پھر جناب زید آپ کے چچا بھی تھے جن کا احترام آپ لازم سمجھ رہے تھے۔ مگر آپ کی انجام بین نگاہ دیکھ رہی تھی کہ یہ اقدام کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے عملی طور سے آپ ان کا ساتھ دینا مناسب نہ

سمجھتے تھے مگر یہ واقعہ ہوتے ہوئے بھی خود ان کی ذات سے آپ کو انتہائی ہمدردی تھی
آپ نے مناسب طریقے پر انہیں مصلحت بینی کی دعوت دی۔ مگر اہل عراق کی ایک بڑی
جماعت کی اطاعت اور وفاداری نے جناب زید کو کامیابی کے توقعات پیدا کر دیئے۔
اور آخر سنہ ۱۲۱ھ میں ظالم فوج شام سے تین روز تک بہادری کے ساتھ جنگ کرنے کے
بعد شہید ہوئے۔ دشمن کا جذبہ انتقام اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ دفن ہو چکنے کے بعد
ان کی لاش کو قبر سے نکالا گیا اور سر کو جدا کر کے ہشام کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا اور لاش
کو دروازہ کوفہ پر سولی دی گئی۔ اور کئی برس تک اسی طرح سے آویزاں رکھا گیا۔ جناب زید
کے ایک سال کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ ابن زید بھی شہید ہوئے۔ یقیناً ان حالات کا امام
جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ مگر ان جذبات سے بلند فرائض کی پابند
ہستی نے اس کے باوجود اپنے خاموش اشغال کو جو اشاعت علوم اہل بیت اور نشر شریعت
کے قدرت کی جانب سے آپ کے سپرد تھے انہیں برابر جاری رکھا۔

انقلاب سلطنت

بنی امیہ کا آخری دور ہنگاموں اور مسلسل شکستوں کا مرکز بن گیا تھا
اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت جلدی جلدی حکومتوں میں تبدیلیاں ہو رہی
تھیں اور اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام کو بہت سی دنیاوی سلطنتوں کے دور سے گزرنا
پڑا۔ ہشام ابن عبد الملک کے بعد ولید ابن یزید ابن عبد الملک پھر یزید ابن ولید ابن عبد الملک
اس کے بعد ابراہیم ابن ولید ابن عبد الملک اور آخر میں مروان حمار پر پہنچ کر بنی امیہ کی ظالم حکومت
کا خاتمہ ہو گیا۔

جب سلطنت کی داخلی کمزوریاں قہر و غلبہ کی چولیں ہلا چکی ہوں تو قدرتی بات ہے کہ
وہ لوگ جو اس حکومت کے مظالم کا نشانہ بن چکے ہوں اور جنہیں ان کے حقوق سے محروم

سکے کہ صرف تشدد کی طاقت سے اٹھنے کا موقع نہ دیا گیا ہو، وہ قفس کی تیلیوں کو کمزور پاکر پھڑپھڑانے کی کوشش کریں گے اور حکومت کے شکنجے کو ایک دم توڑ دینا چاہیں گے، سوائے ایسے بلند افراد کے جو جذبات کی پیروی سے بلند ہوں۔ عام طور پر اس طرح کی انتقامی کوششوں میں مصلحت اندیشی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے کا امکان ہے، مگر وہ انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو ہے جس سے خاص خاص افراد ہی مستثنےٰ ہو سکتے ہیں۔

بنی ہاشم میں عام طور پر سلطنت بنی امیہ کے اس آخری دور میں اسی لیے ایک حرکت اور غیر معمولی اضطراب پایا جا رہا تھا۔ اس اضطراب سے بنی عباس نے فائدہ اٹھایا انھوں نے اس آخری دور امویت میں پوشیدہ طریقے سے ممالک اسلامیہ میں ایک ایسی جماعت بنائی جس نے قسم کھائی تھی کہ ہم سلطنت کو بنی امیہ سے لے کر بنی ہاشم تک پہنچائیں گے جن کا وہ واقعی حق ہے۔ حالانکہ حق قرآن میں صرف مخصوص ہستیوں ہی میں منحصر تھا جو خدا کی طرف سے نوع انسانی کی رہبری اور سرداری کے حق دار قرار دیے گئے تھے۔ مگر وہ جذبات سے بلند انسان تھے جو قوم کی سیاسی رفتار سے ہنگامی فوائد حاصل کرنا اپنا نصب العین نہ رکھتے تھے سلسلہ بنی ہاشم میں سے ان حضرات کی خاموشی قائم رہنے کے ساتھ اس ہمدردی کو جو عوام میں خاندان ہاشم کے ساتھ پائی جاتی تھی بنی عباس نے اپنے لیے حصول سلطنت کا ذریعہ قرار دیا۔ حالانکہ انھوں نے سلطنت پانے کے ساتھ بنی ہاشم کے اصلی حق داروں سے ویسا ہی یا اس سے زیادہ سخت سلوک کیا جو بنی امیہ ان کے ساتھ کر چکے تھے۔ یہ اقعات مختلف اماموں کے حالات میں آئندہ آپ کے سامنے آئیں گے۔

بنی عباس میں سے سب سے پہلے محمد ابن علی ابن عبداللہ ابن عباس نے بنی امیہ کے خلاف تحریک شروع کی اور ایران میں مبلغین بھیجے جو مخفی طریقہ پر لوگوں سے بنی ہاشم کی وفاداری کا

عہد و پیمان حاصل کریں۔ محمد ابن علی کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم قائم مقام ہوئے۔ جناب زید اور ان کے
صاحبزادے جناب یحییٰ کے دردناک واقعات شہادت سے بنی امیہ کے خلاف غم و غصہ میں اضافہ
ہو گیا۔ اس سے بھی بنی عباس نے فائدہ اٹھایا۔ اور ابو سلمہ خلال کے ذریعہ سے عراق میں بھی اپنے
اثرات قائم کرنے کا موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کے حلقہ اثر میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ابو مسلم خراسانی
کی مدد سے عراق عجم کا پورا علاقہ قبضہ میں آگیا اور بنی امیہ کی طرف کے حاکم کو وہاں سے فرار ہونا
پڑا۔ ۱۲۹ھ سے عراق عجم اور خراسان وغیرہ میں سلاطین بنی امیہ کے نام خطبہ سے خارج
ہو کر ابراہیم ابن محمد کا نام داخل کر دیا گیا۔

ابھی تک سلطنت بنی امیہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ ایک مقامی مخالفت حکومت سے ہے
جو ایران میں محدود ہے مگر اب جاسوسوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق ابراہیم ابن محمد عباسی
کے ساتھ ہے جو مقام جابلقا میں رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابراہیم کو قید کر دیا گیا اور قید خانہ
ہی میں ان کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے پسماندگان اور دوسرے افراد بنی عباس کے ساتھ بھاگ کر
عراق میں ابو سلمہ کے پاس چلے گئے۔ ابو مسلم خراسانی کو جو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو ایک فوج
کو عراق کی طرف روانہ کیا جس نے اموی طاقت کو شکست دے کر عراق کو آزاد کرا لیا۔

ابو سلمہ خلال جو وزیر آل محمدؐ کے نام سے مشہور ہیں بنی فاطمہ کے ساتھ عقیدت رکھتے
تھے۔ انہوں نے چند خطوط اولاد رسول میں سے چند بزرگوں کے نام لکھے اور ان کو قبول خلافت
کی دعوت دی۔ ان میں سے ایک خط حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے نام بھی تھا۔ سیاست
کی دنیا میں ایسے موقع اپنے اقتدار کے قائم کرنے کے لیے غنیمت سمجھے جاتے ہیں مگر وہ انسانی
خودداری استغنا کا مثالی مجسمہ تھا جس نے اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے اس موقع کو ٹھکرا دیا
اور بجائے جواب دینے کے حقارت آمیز طریقہ پر اس خط کو آگ کی نذر کر دیا۔

ادھر کوفہ میں ابو مسلم خراسانی کے تابعین اور بنی عباس کے ہوا خواہوں نے عبداللہ سفاح کے ہاتھ پر ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲ھ کو بیعت کر لی اور اس کو امت اسلامیہ کا خلیفہ اور فرماں روا تسلیم کر لیا۔ عراق میں اقتدار قائم کر لینے کے بعد انہوں نے دمشق پر چڑھائی کر دی۔ مروان حمار نے بھی بڑے لشکر کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مگر بہت جلد اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ مروان نے فرار کیا اور آخر افریقہ کی سرزمین پر پہنچ کر قتل ہوا۔ اس کے بعد سفاح نے بنی امیہ کا قتل عام کرایا۔ سلاطین بنی امیہ کی قبریں کھدوائیں اور ان کی لاشوں کے ساتھ عبرت ناک طریقے اختیار کیے گئے اس طرح قدرت کا انتقام جو ان ظالموں سے لیا جانا ضروری تھا بنی عباس کے ہاتھوں دنیا کی نگاہ کے سامنے آیا۔ ۱۳۶ھ میں ابو عبداللہ سفاح بنی عباس کے پہلے خلیفہ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور تخت خلافت پر بیٹھا جو منصور دوانیقی کے نام سے مشہور ہے۔

سادات پر مظالم — یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی عباس نے ان ہمدردیوں سے جو عوام کو بنی فاطمہ کے ساتھ تھیں ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور انہوں نے دنیا کو یہ فریب دیا تھا کہ ہم اہل بیت رسول کے حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے رضائے آل محمد ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی نصرت و حمایت پر آمادہ کیا تھا اور اسی کو اپنا نعرہ جنگ قرار دیا تھا۔ اس لیے انہیں برسر اقتدار آنے کے بعد اور بنی امیہ کو تباہ کرنے کے بعد سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ہمارا یہ فریب دنیا پر کھل نہ جائے اور یہ تحریک نہ پیدا ہو جائے کہ خلافت بنی عباس کے بجائے بنی فاطمہ کے سپرد ہونا چاہیے۔ جو حقیقت میں آل رسول ہیں۔ ابو مسلم خلال بنی فاطمہ کے ہمدردوں میں سے تھا۔ اس لیے یہ خطرہ تھا کہ وہ اس تحریک کی حمایت نہ کرے۔ اس لیے سب سے پہلے ابو سلمہ کو راستے سے ہٹایا گیا اور وہ باوجود ان احسانات کے جو بنی عباس کے ساتھ کر چکا تھا سفاح ہی کے زمانہ میں تشدد کا نشانہ بنا اور تلوار کے گھاٹ اتارا گیا۔

ایران میں ابو مسلم خراسانی کا اثر تھا۔ منصور نے انتہائی مکاری اور غداری کے ساتھ اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اب آپ اپنی مملکت میں کسی با اثر اور صاحب اقتدار شخصیت کی مزاحمت کا اندیشہ نہ تھا اب اس کے ظلم و ستم کا رخ سادات بنی فاطمہ کی طرف مڑا۔ مولانا شبلی سیرۃ النعمان میں لکھتے ہیں۔ "صرف بدگمانی پر منصور نے سادات علویین کی بیخ کنی شروع کر دی جو لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ زیادہ بے رحمیاں کی گئیں۔ محمد بن ابراہیم بن حسن جمال میں یگانہ روزگار تھے اور اسی وجہ سے دیباج کہلاتے تھے زندہ دیواروں میں چنوا دیئے گئے ان بے رحمیوں کی ایک داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیئے۔"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر ان حالات کا بہت اثر ہوتا تھا۔ جب سادات بنی حسن طوق و زنجیر میں قید کر کے مدینہ سے لے جائے جا رہے تھے تو حضرت اپنے مکان کی آڑ میں کھڑے ہوئے ان کی حالت دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ "افسوس کہ مدینہ بھی دار الامن نہ رہا۔" پھر آپ نے اولاد انصار کی حالت پر افسوس کیا کہ انصار نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس عہد پیمان پر مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی تھی کہ ہم آپ کی اور آپ کی اولاد کی اسی طرح حفاظت و حمایت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال اور جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں مگر آج انصار کی اولاد باقی ہے اور کوئی ان سادات کی مدد نہیں کرتا۔ یہ فرما کر آپ بیت الشرف کی طرف واپس ہوئے اور بیس دن تک شدت سے بیمار رہے۔

ان قیدیوں میں امام حسن علیہ السلام کے صاحبزادے عبداللہ محض بھی تھے جنہوں نے کبر سنی کے عالم میں عرصہ تک قید کی مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کے بیٹے محمد نفس زکیہ نے حکومت کا مقابلہ کیا اور ۱۴۵ھ میں دشمن کے ہاتھ سے مدینہ منورہ کے قریب شہید ہوئے۔

جوان بیٹے کا سر بوڑھے باپ کے پاس قید خانہ میں بھیجا گیا اور یہ صدمہ ایسا تھا کہ جس سے عبداللہ محض پھر زندہ نہ رہ سکے اور ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔ اس کے بعد عبداللہ کے دوسرے صاحبزادے ابراہیم بھی منصور کی فوج کے مقابلے میں جنگ کرتے کوفہ میں شہید ہوئے۔ اسی طرح عباس ابن حسن، عمر ابن حسن مثنیٰ، علی و عبداللہ فرزندان نفس زکیہ، موسیٰ اور یحییٰ برادران نفس زکیہ وغیرہ بھی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیے گئے۔ بہت سے سادات عمارتوں میں زندہ چنوا دیے گئے۔

امام کے ساتھ بدسلوکیاں

ان تمام ناگوار حالات کے باوجود جن کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ اوپر لکھا گیا، امام جعفر صادق علیہ السلام خاموشی کے ساتھ علوم اہل بیت کی اشاعت میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگ بھی جو حیثیت امامت سے آپ کی معرفت نہ رکھتے تھے یا آپ سے سیاسی ٹکر لینا نہیں چاہتے تھے وہ بھی آپ کی علمی عظمت کو مانتے ہوئے آپ کے حلقۂ درس میں داخل ہونے کو فخر سمجھتے تھے۔

منصور نے پہلے حضرت کی علمی عظمت کا اثر عوام کے دل سے کم کرنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ آپ کے مقابلے میں ایسے اشخاص کو بحیثیت فقیہ اور عالم کے کھڑا کر دیا جو آپ کے شاگردوں کے سامنے بھی زبان کھولنے کی قدرت نہ رکھتے تھے اور پھر وہ خود اس کا اقرار کرتے تھے کہ ہمیں جو کچھ آیا وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ سے حاصل ہوا۔ مگر اقتدار حکومت ان کے فتوے کو مستند قرار دیتا تھا۔ اور اس طرح حضرت صادق آل محمدؐ کی مرجعیت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو حضرت کی ایذا رسانی اور قتل یا گرفتاری کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ اس کے لیے ہر شہر اور ہر ہر قصبہ میں جاسوس مقرر کیے گئے جو شیعوں کے حالات پر نظر رکھیں اور جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی محبت کا

دم بھرتا ہے آپ کو گرفتار کیا جائے۔

چنانچہ معلی ابن خنیس ان ہی شیعوں میں سے تھے جو گرفتار کیے گئے اور ظلم و ستم کے ساتھ شہید کیے گئے۔ خود امام جعفر صادق علیہ السلام کو تقریباً پانچ مرتبہ مدینہ سے دربار شاہی میں طلب کیا گیا۔ جو آپ کے لیے سخت روحانی تکلیف کا باعث تھا۔ یہ اسباب ہے کہ کسی مرتبہ آپ کے خلاف کوئی بہانہ اسے ایسا نہ مل سکا کہ وہ آپ کے قید یا قتل کیے جانے کا حکم دیتا بلکہ اس سلسلے میں عراق کے اندر ایک مدت کے قیام سے علوم اہل بیت کی اشاعت کا حلقہ وسیع ہوا۔ اور اس کو محسوس کر کے منصور نے پھر آپ کو مدینہ بھجوا دیا۔ اس کے بعد بھی آپ ایذا رسانی سے محفوظ نہیں رہے یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ قدرت خدا تھی کہ وہ آگ جلد فرو ہو گئی اور آپ کے متعلقین اور اصحاب کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

اخلاق و اوصاف

آپ اس سلسلہ عصمت کی ایک کڑی تھے جسے اللہ نے عالم کے لیے نوع انسانی کے لیے نمونہ کامل بنا کر پیدا کیا تھا۔ ان کے اخلاق و اوصاف زندگی کے ہر شعبہ میں معیاری حیثیت رکھتے تھے۔ خاص خاص اوصاف جن کے متعلق مورخین نے مخصوص طور پر واقعات نقل کیے ہیں۔ مہمان نوازی، خیر و خیرات، مخفی طریقہ پر غرباء کی خبرگیری، عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک، عفو جرائم، صبر و تحمل وغیرہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک حاجی مدینہ میں وارد ہوا۔ اور مسجد رسول میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اسے شبہ ہوا کہ اس کی ایک ہزار کی تھیلی موجود نہیں ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کسی کو نہ پایا۔ ایک گوشہ مسجد میں امام جعفر صادق علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ آپ کو بالکل نہ پہچانتا تھا۔ آپ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ "میری تھیلی تم نے لی ہے"۔ حضرت نے فرمایا "اس میں کیا تھا؟" اس نے کہا "ایک ہزار دینار"۔ حضرت نے فرمایا "میرے ساتھ

میرے مکان تک آؤ۔" وہ آپ کے ساتھ ہو گیا۔ بیت الشرف پر تشریف لا کر ایک ہزار دینار
اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ مسجد میں واپس گیا اور اپنا اسباب اٹھانے لگا تو خود اس کی
دیناروں کی تھیلی اسباب میں نظر آئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور دوڑتا ہوا پھر امام
کی خدمت میں آیا اور عذر خواہی کرتے ہوئے وہ ہزار دینار واپس کرنا چاہے۔ حضرت نے
فرمایا۔ "ہم جو کچھ دے دیتے ہیں وہ پھر واپس نہیں لیتے۔"

موجودہ زمانہ میں یہ حالات سب ہی کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ہیں کہ جب یہ
اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اناج مشکل سے ملے گا تو شخص کو جتنا ممکن ہو وہ اناج خرید کر رکھ لیتا ہے
مگر امام جعفر صادق علیہ السلام کے کردار کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے وکیل
معتب سے ارشاد فرمایا کہ غلہ روز بروز مدینہ میں گراں ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں
کس قدر غلہ ہوگا؟ معتب نے کہا کہ ہمیں اس گرانی اور قحط کی تکلیف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔
ہمارے پاس غلہ کا اتنا ذخیرہ ہے جو بہت عرصہ تک کافی ہوگا۔" حضرت نے فرمایا۔ "یہ تمام
غلہ فروخت کر ڈالو۔ اس کے بعد جو حال سب کا ہو وہی ہمارا بھی ہو۔" جب غلہ فروخت
کر دیا گیا تو فرمایا۔ "اب خالص گیہوں کی روٹی نہ پکا کرے۔ بلکہ آدھے گیہوں اور آدھے
جو۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں غریبوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔"

آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ مال داروں سے زیادہ غریبوں کی عزت کرتے تھے مزدوروں کی
بڑی قدر فرماتے تھے۔ خود بھی تجارت فرماتے تھے اور اکثر اپنے باغوں میں بہ نفس نفیس محنت
بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بیلچہ ہاتھ میں لیے باغ میں کام کر رہے تھے۔ اور پسینہ سے
تمام جسم تر ہو گیا تھا کسی نے کہا: "یہ بیلچہ مجھے عنایت فرمائیے کہ میں یہ خدمت انجام دوں۔"
حضرت نے فرمایا: "طلب معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف سہنا عیب کی بات نہیں

غلاموں اور کنیزوں پر بھی مہربانی رہتی تھی جو اس گھرانے کی امتیازی صفت تھی۔ اس کا ایک حیرت انگیز نمونہ یہ ہے کہ جسے سفیان ثوری نے بیان کیا ہے کہ "میں ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا "میں نے منع کیا تھا کہ کوئی مکان کے کوٹھے پر نہ چڑھے۔ اس وقت جو گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک کنیز جو ایک بچے کی پرورش پر معین تھی اُسے گود میں لئے زینے سے اوپر جا رہی ہے۔ مجھے دیکھا تو ایسا خوف طاری ہوا کہ بدحواسی میں بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس صدمہ سے جاں بحق تسلیم ہوا۔ مجھے بچے کے مرنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اس کا رنج ہے کہ اس کنیز پر اتنا رعب و ہراس کیوں طاری ہوا۔ پھر حضرت نے اس کنیز کو پکار کر فرمایا "ڈرو نہیں میں نے تم کو راہ خدا میں آزاد کر دیا۔" اس کے بعد حضرت بچے کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔

اشاعت علوم

تمام عالم اسلامی میں آپ کی علمی جلالت کا شہرہ تھا۔ دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں فقہ کے علما بھی تھے تفسیر کے بھی، متکلمین بھی تھے اور مناظرین بھی۔ آپ کے دربار میں مخالفین مذہب آ آ کر سوالات پیش کرتے تھے اور آپ کے اصحاب سے اور ان سے مناظرے ہوتے رہتے تھے جن پر کبھی کبھی مناظرے کے ختم ہونے پر اور فریق مخالف کے شکست کھا کر چلے جانے کے بعد آپ نقد و تبصرہ بھی فرماتے تھے اور اصحاب کو ان کی بحث کے کمزور پہلو بتلا بھی دیتے تھے تا کہ آئندہ وہ ان باتوں کا خیال رکھیں۔ کبھی آپ خود بھی مخالفین مذہب اور بالخصوص دہریوں سے مناظرہ فرماتے تھے۔ علاوہ علوم فقہ و کلام وغیرہ کے علوم غریبہ

جیسے ریاضی اور کیمیا وغیرہ کی بھی بعض شاگردوں کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ آپ کے اصحاب میں سے جابر ابن حیان طرسوسی سائنس اور ریاضی کے مشہور امام فن ہیں جنہوں نے چار سو (۴۰۰) رسالے امام جعفر صادق علیہ السلام کے افادات کو حاصل کر کے تصنیف کیے۔ آپ کے اصحاب میں سے بہت سے بڑے فقہا رہے جنہوں نے کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔

وفات

ایسی مصروف زندگی رکھنے والے انسان کو جاہ و سلطنت کے حاصل کرنے کی فکروں سے کیا مطلب؟ مگر آپ کی علمی مرجعیت اور کمالات کی شہرت ہی سلطنت وقت کے لیے ایک مستقل خطرہ محسوس ہوتی تھی جبکہ یہ معلوم تھا کہ اصلی خلافت کے حق دار یہ ہی ہیں۔ جب حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود کوئی بہانہ آپ کے خلاف کسی کھلے ہوئے اقدام اور خوں ریزی کا نہ مل سکا تو آخر خاموش حربہ زہر کا اختیار کیا گیا۔ زہر آلود انگور حاکم مدینہ کے ذریعے سے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے جن کے کھانے سے زہر کا اثر جسم میں سرایت کر گیا اور ۱۵ شوال سنہ ۱۴۸ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کے فرزند اکبر اور جانشین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں اس احاطے میں کہ جہاں اس کے پہلے امام حسن علیہ السلام امام زین العابدین علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام دفن ہو چکے تھے آپ کو بھی دفن کیا گیا۔

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی،

آنریری سکریٹری

امامیہ مشن

لکھنؤ

مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ	رسالہ نمبر ۱۰۴ امامیہ مشن، لکھنؤ

(از)

سید العلماء جناب مولانا

سید علی نقی صاحب قبلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جبکہ دنیا ظلم و استبداد کے شکنجوں میں کراہ رہی ہے اور جبر و قہر کی بے پناہ طاقتوں کے سامنے سچائی کے اصول اور ضمیر کے فیصلے پر قائم رہنا بہت ہی مشکل نظر آ رہا ہے تو ان رہنماؤں کی سیرت زندگی کا مطالعہ دلوں میں قوت اور سیرت میں استقلال پیدا کر سکتا ہے جن کو اپنے زمانہ کی طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں اپنی سچی راہ پر قائم رہنے کی وجہ سے مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا، قید کی کڑیاں جھیلیں اور طرح طرح کی سختیاں اٹھائیں مگر اس فرض کو نہ چھوڑا جس کے وہ قدرت کی طرف سے ذمہ دار بنائے جا چکے تھے۔ اسی لئے ائمہ اہلبیت کے سوانح کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے اور اس رسالہ میں ان میں سے ساتویں امام کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔ خدا کرے اس میں کا کوئی ایک جملہ یا کوئی ایک لفظ کسی پریشان انسان کے لئے عمل کی منزل میں راستہ بتا سکے تو یہی اس خدمت کا ماحصل ہوگا۔

نام و نسب:- اسم مبارک موسیٰ، کنیت ابوالحسنؑ اور لقب کاظمؑ تھا اور اسی لئے امام موسیٰ کاظمؑ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے۔ جن کا خاندانی سلسلہ حضرت امام حسینؑ شہید کربلا کے واسطہ سے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ حمیدہ خاتون ملک بربر کی باشندہ تھیں۔

ولادت:۔ سات صفر ۱۲۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت آپ کے والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسند امامت پر متمکن تھے اور آپ کے فیوض علمی کا دھارا پوری طاقت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اگرچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پہلے آپ کے دو بڑے بھائی اسمٰعیل اور عبداللہ پیدا ہو چکے تھے۔ مگر اس صاحبزادہ کی ولادت سے گھرانے کو وہ خوشی ہوئی جو اس کے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ اُس روحانی امانت کا حامل جو رسولؐ کے بعد اس سلسلہ کے افراد میں ایک دوسرے کے بعد چلی آرہی تھی یہ ہی پیدا ہونے والا مبارک بچہ تھا۔

نشو و نما اور تربیت:۔ بیس برس آپ کی عمر کے اپنے والد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السلام کے سایۂ تربیت میں گزرے ایک طرف خدا کے دیئے ہوئے فطری کمال کے جوہر اور دوسری طرف اس باپ کی تربیت جس نے پیغمبر کے بتائے ہوئے مکارم اخلاق کی یاد کو بھولی ہوئی دنیا میں ایسا تازہ کر دیا کہ انھیں ایک طرح سے اپنا بنا لیا۔ اور جن کی بنا پر ملت جعفری نام ہو گیا، اسی مقدس آغوش تعلیم میں بچپنا اور جوانی کا کافی حصّہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے گذارا یہاں تک کہ تمام دنیا کے سامنے آپ کے ذاتی کمالات و فضائل روشن ہو گئے اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ باوجودیکہ آپ کے بڑے بھائی بھی موجود تھے،

مگر خدا کی طرف کا منصب میراث کا ترکہ نہیں ہے بلکہ ذاتی کمال کو ڈھونڈھتا ہے
سلسلہ معصومینؑ میں امام حسنؑ کے بعد بجائے ان کی اولاد کے امام حسینؑ کا
امام ہونا اور اولاد امام جعفر صادق علیہ السلام میں بجائے فرزند
اکبر کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی طرف امامت کا منتقل ہونا اس کا ثبوت ہے
کہ معیار امامت میں نسبی وراثت کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔

امامت :- ۱۴۸ھ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات ہوئی
اس وقت سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بذات خود فرائض امامت
کے ذمہ دار ہوئے۔ اس وقت سلطنت عباسیہ کے تخت پر منصور دوانقی
بادشاہ تھا یہ وہی ظالم بادشاہ تھا جس کے ہاتھوں لاتعداد سادات مظالم کا
نشانہ بن چکے تھے۔ تلوار کے گھاٹ اتارے گئے تھے یا دیوار میں چنوا دیئے گئے تھے
یا قید رکھے گئے تھے۔ خود امام جعفر صادق علیہ السلام کو خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جا چکی تھیں اور
مختلف صورتوں سے تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ منصور ہی کا بھیجا ہوا زہر تھا جس
سے آپ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے ان حالات میں آپ کو اپنے جانشین
کے متعلق یہ قطعی اندیشہ تھا کہ حکومت وقت اسے زندہ نہ رہنے دے گی۔
اس لیے آپ نے آخری وقت ایک اخلاقی بوجھ حکومت کے کاندھوں پر رکھ دینے
کے لئے یہ صورت اختیار فرمائی کہ آپ نے اپنی جائداد اور گھر بار کے انتظام کے لئے پانچ
شخصوں کی ایک جماعت مقرر فرمائی جن میں پہلا شخص خود خلیفۂ وقت منصور عباسی تھا

اس کے علاوہ محمد بن سلیمان حاکم مدینہ اور عبداللہ افطح جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
کے سن میں بڑے بھائی تھے۔ اور حضرت امام موسیٰ کاظم اور ان کی والدہ معظمہ حمیدہ خاتون
امام کا اندیشہ بالکل صحیح تھا اور آپ کا تحفظ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ چنانچہ
جب حضرت کی وفات کی اطلاع منصور کو پہنچی تو اس نے پہلے تو سیاسی مصلحت
سے اظہار رنج کیا تین مرتبہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور کہا کہ اب بھلا جعفر کا
مثل کون ہے۔ اس کے بعد حاکم مدینہ کو لکھا کہ اگر جعفر صادق نے کسی شخص کو
اپنا وصی مقرر کیا ہو تو اس کا سر فوراً قلم کر دو۔ حاکم مدینہ نے جواب لکھا کہ انہوں نے تو
پانچ وصی مقرر کئے ہیں جن میں سے پہلے آپ خود ہیں۔ یہ جواب پڑھ کر منصور دیر تک
خاموش رہا اور سوچنے کے بعد کہنے لگا کہ اس صورت میں تو یہ لوگ قتل نہیں کئے جا سکتے
اور اس کے بعد دس برس منصور زندہ رہا لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کوئی تعرض
نہیں کیا اور آپ مذہبی فرائض امامت کی انجام دہی میں امن و سکون کے ساتھ مصروف
رہے۔ یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں منصور شہر بغداد کی تعمیر میں مصروف تھا جس سے
۱۵۷ھ میں یعنی اپنی موت سے صرف ایک سال پہلے اسے فراغت ہوئی، اس لیے
وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے متعلق کسی ایذا رسانی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔
منصور کا انتقال: سنہ ۱۵۸ھ کے آخر میں منصور دوانقی دنیا سے رخصت ہوا اور
اس کا بیٹا مہدی تخت سلطنت پر بیٹھا۔ شروع میں تو اس نے بھی امام موسیٰ کاظم
علیہ السلام کی عزت و احترام کے خلاف کوئی برتاؤ نہیں کیا مگر چند سال کے بعد
پھر وہی بنی فاطمہ کی مخالفت کا جذبہ ابھرا اور سنہ ۱۶۴ھ میں جب وہ حج کے نام

حجاز کی طرف آیا تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اپنے ساتھ مکہ سے بغداد میں لے گیا
اور قید کر دیا ایک سال تک حضرت اس کی قید میں رہے پھر اس کو اپنی غلطی کا
احساس ہوا اور حضرت کو مدینہ کی طرف واپسی کا موقع دیا گیا۔ مہدی کے بعد
اس کا بھائی ہادی ۱۶۹ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور صرف ایک سال
ایک مہینہ تک اس نے سلطنت کی اس کے بعد ہارون الرشید کا زمانہ آیا جس میں
پھر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو آزادی کے ساتھ سانس لینا نصیب نہیں ہوئی

اخلاق و اوصاف :- حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس مقدس سلسلہ
کی ایک فرد تھے جن کو خالق نے نوع انسان کے لئے معیار کمال قرار دیا تھا۔
اس لئے ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں بہترین اخلاق و اوصاف کا مرقع تھا
بے شک یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افراد میں بعض صفات اتنے ممتاز نظر
آتے ہیں کہ سب سے پہلے ان پر نظر پڑتی ہے۔ چنانچہ ساتویں امام میں تحمل و
برداشت اور غصہ کو ضبط کرنے کی صفت اتنی نمایاں تھی کہ آپ کا لقب کاظم
قرار پا گیا جس کے معنی ہی ہیں غصے کو پینے والا۔ آپ کو کبھی کسی نے ترش روئی اور
سختی کے ساتھ بات کرتے نہیں دیکھا اور انتہائی ناگوار حالات میں بھی مسکراتے ہوئے
نظر آئے۔ مدینہ کے ایک حاکم سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچیں یہاں تک کہ وہ جناب
امیر علیہ السلام کی شان میں بھی نازیبا الفاظ استعمال کیا کرتا تھا مگر حضرت نے
اپنے اصحاب کو ہمیشہ اس کے جواب دینے سے روکا۔
جب اصحاب نے اس کی گستاخیوں کی بہت شکایت کی اور یہ کہا کہ

ہمیں ضبط کی تاب نہیں ہمیں اس سے انتقام لینے کی اجازت دی جائے تو حضرت
نے فرمایا کہ "میں خود اس کا تدارک کروں گا" اس طرح ان کے جذبات میں سکون
پیدا کرنے کے بعد حضرت خود اس شخص کے پاس اس کی زراعت پر تشریف لے
گئے اور کچھ ایسا احسان اور حسن سلوک فرمایا کہ وہ اپنی گستاخیوں پر نادم ہوا۔ اور
اپنے طرز عمل کو بدل دیا۔ حضرت نے اپنے اصحاب سے صورت حال بیان فرما کر
پوچھا کہ جو میں نے اس کے ساتھ کیا وہ اچھا تھا یا جس طرح تم لوگ اس کے ساتھ
کرنا چاہتے تھے سب نے کہا کہ یقیناً حضور نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہی بہتر تھا
اس طرح آپ نے اپنے جد بزرگوار حضرت امیر علیہ السلام کے اس ارشاد کو
عمل میں لا کر دکھلایا جو آج تک نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ اپنے دشمن پر
احسان کے ساتھ فتح حاصل کرو۔ کیونکہ یہ دو قسم کی فتح میں زیادہ پر لطف
کامیابی ہے۔ بے شک اس کے لئے فریق مخالف کے ظرف کا صحیح اندازہ ضروری ہے
اور اسی لئے حضرت علیؑ نے ان الفاظ کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ "خبردار
یہ عدم تشدد کا طریقہ نا اہل کے ساتھ اختیار نہ کرنا ورنہ اس کے تشدد میں
اضافہ ہو جائے گا۔"

یقیناً ایسے عدم تشدد کے موقع کو پہچاننے کے لئے ایسی ہی بالغ نگاہ
کی ضرورت ہے جیسی امام کو حاصل تھی مگر یہ اس وقت میں ہے جب مخالف کی طرف
سے کوئی ایسا عمل ہو چکا ہو جو اس کے ساتھ انتقامی تشدد کا جواز پیدا کر سکے
لیکن اگر اس کی طرف سے کوئی اقدام ابھی ایسا نہ ہوا ہو تو یہ حضرات بہر حال

اُس کے ساتھ احسان کرنا پسند کرتے تھے تاکہ اُس کے خلاف حجت قائم ہو اور اسے
اپنے جارحانہ اقدام کے لئے تلاش سے بھی کوئی عذر نہ مل سکے۔ بالکل اسی طرح
جیسے ابن ملجم کے ساتھ جو جناب امیر علیہ السلام کو شہید کرنے والا تھا۔ آخر وقت
تک جناب امیر علیہ السلام احسان فرماتے رہے اسی طرح محمد ابن اسمٰعیل کے
ساتھ جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جان لینے کا باعث ہوا۔ آپ برابر احسان
فرماتے رہے یہاں تک کہ اس سفر کے لئے جو اس نے مدینہ سے بغداد کی جانب
خلیفہ عباسی کے پاس امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شکایتیں کرنے کے لئے کیا تھا
ساڑھے چار سو دینار اور ڈیڑھ سو درہم کی رقم خود حضرت ہی نے عطا فرمائی
تھی جس کو لے کر وہ روانہ ہوا تھا۔ آپ کو زمانہ بہت ناسازگار ملا تھا۔ نہ اس وقت
وہ علمی دربار قائم رہ سکتا تھا جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں قائم
رہ چکا تھا۔ نہ دوسرے ذرائع سے تبلیغ و اشاعت ممکن تھی بس آپ کی خاموش
سیرت ہی تھی جو دنیا کو آل محمدؐ کے تعلیمات سے روشناس بنا سکتی تھی۔

آپ اپنے مجمعوں میں بھی اکثر بالکل خاموش رہتے تھے یہاں تک
کہ جب تک آپ سے کسی امر کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔ آپ گفتگو میں ابتدا
بھی نہ فرماتے تھے اس کے باوجود آپ کی علمی جلالت کا سکہ دوست اور دشمن
سب کے دل پر قائم تھا اور آپ کی سیرت کی بلندی کو بھی سب مانتے تھے
اسی لئے عام طور پر آپ کو کثرت عبادت اور شب زندہ داری کی وجہ سے
"عبد صالح" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا بھی

خاص شہرہ تھا۔ اور فقرائے مدینہ کی اکثر پوشیدہ طور پر خبرگیری فرماتے تھے۔ نماز صبح
تعقیبات کے لیے آفتاب کے بلند ہونے کے بعد سے پیشانی سجدے میں رکھ دیتے
تھے اور زوال کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ قرآن مجید کی نہایت دلکش انداز میں تلاوت
فرماتے تھے۔ خود بھی روتے جاتے تھے اور پاس بیٹھنے والے بھی آپ کی آواز سے متاثر
ہو کر روتے تھے۔

ہارون رشید کی خلافت اور امام موسیٰ کاظم سے مخالفت: سنہ ۱۷۰ھ
میں ہارون رشید تخت خلافت پر بیٹھا۔ سلطنت عباسیہ کے قدیم روایات
جو سادات بنی فاطمہ کی مخالفت میں تھے اس کے سامنے تھے۔ خود اس کے باپ
منصور کا رویہ جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے خلاف تھا اسے معلوم تھا۔ اس کا
یہ ارادہ کہ جعفر صادق کے جانشین کو قتل کر ڈالا جائے اب تک شاید ہارون کو
معلوم ہو چکا ہوگا۔ وہ تو امام جعفر صادق کی حکیمانہ وصیت کا اخلاقی دباؤ تھا جس نے
منصور کے ہاتھ باندھ دیے تھے اور جانشین کی تشہیر کی مصروفیت تھی جس نے اس
کو اس جانب متوجہ نہ ہونے دیا تھا۔ اب ہارون کے لیے ان میں سے کوئی بات مانع نہ تھی۔
تخت سلطنت پر بیٹھ کر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے یہی تصور پیدا ہو سکتا
تھا کہ اس روحانی نیابت کے مرکز کو جو مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں قائم ہے توڑنے کی کوشش
کی جائے۔ مگر ایک طرف امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا محتاط اور خاموش طرز عمل اور
دوسری طرف سلطنت کے اندرونی مشکلات ان کی وجہ سے نو برس تک ہارون کو
بھی کسی کھلے ہوئے تشدد کا امام کے خلاف موقع نہیں ملا۔

اس دوران میں عبداللہ ابن حسن کے فرزند یحییٰ کا واقعہ پیش آیا اور وہ
امان دیئے جانے کے بعد تمام عہد و پیمان کو توڑ کر دردناک طریقے پر پہلے قید کئے گئے اور
پھر قتل کئے گئے۔ باوجودیکہ یحییٰ کے معاملات سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کسی طرح کا
سروکار نہ تھا۔ بلکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ان کو حکومت وقت کی مخالفت سے
منع فرماتے تھے مگر عداوت بنی فاطمہ کا جذبہ جو یحییٰ بن عبداللہ کی مخالفت کے بہانے سے
ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کی زد سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ آخر یحییٰ بن
خالد برمکی نے جو وزیر اعظم تھا امین (فرزند ہارون رشید) کے اتالیق جعفر ابن محمد
اشعث کی رقابت میں اس کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
کے شیعوں میں سے ہے اور ان کے اقتدار کا خواہاں ہے۔

براہ راست اس کا مقصد ہارون کو جعفر سے برگشتہ کرنا تھا لیکن بالواسطہ
اس کا تعلق حضرت موسیٰ کاظم کے ساتھ بھی تھا۔ اس لیے ہارون کو حضرت کی طرف سے بدگمانی
کی فکر پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں یہ واقعہ ہوا کہ ہارون رشید حج کے ارادہ سے مکہ
معظمہ میں آیا۔ اتفاق سے اسی سال امام موسیٰ کاظم بھی حج کو تشریف لے گئے ہوئے تھے
ہارون نے اپنی آنکھ سے اس عظمت اور مرجعیت کا مشاہدہ کیا جو مسلمانوں میں امام موسیٰ کاظم
کے متعلق پائی جاتی تھی۔ اس سے بھی اس کے حسد کی آگ بھڑک اٹھی اس کے بعد اس میں محمد
بن اسمٰعیل کی مخالفت نے اور اضافہ کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسمٰعیل امام جعفر صادق علیہ السلام کے بڑے فرزند تھے اور امامؑ
ان کی زندگی میں عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے قائم مقام

ہو گئے۔ مگر ان کا انتقال امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں ہو گیا اور لوگوں کا یہ خیال غلط
ثابت ہوا لیکن پھر بھی بعض سادہ لوح اصحاب اس خیال پر قائم رہے کہ جانشینی کا حق اسمٰعیل اور اولاد
اسمٰعیل میں مخصوص ہے۔ انہوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ اسماعیلیہ
فرقہ مختصر تعداد میں سہی اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ محمدؐ ان ہی اسمٰعیل کے فرزند تھے اور اس لیے امام
موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک طرح کی مخالفت پہلے سے رکھتے تھے مگر چونکہ ان کے ماننے والوں کی
تعداد بہت کم تھی اور وہ افراد کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے اس لیے ظاہری طور پر یہ امام موسیٰ
کاظم علیہ السلام کے یہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور ظاہری طور پر قرابت داری کے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔

ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی مخالفت کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے یحییٰ برمکی
سے مشورہ لیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اولاد ابو طالبؑ میں سے کسی کو بلا کر اس سے موسیٰ بن جعفر کے پورے
پورے حالات دریافت کروں۔ یحییٰ جو خود عداوت بنی فاطمہ میں ہارون سے کم نہ تھا اس نے محمد ابن اسمٰعیل کا پتہ دیا
کہ آپ ان کو بلا کر دریافت کریں تو صحیح حالات معلوم ہو سکیں گے چنانچہ اسی وقت محمد ابن اسماعیل کے نام خط لکھا

شہنشاہ وقت کا خط جو محمد ابن اسمٰعیل کو پہنچا تو اسے اپنی دنیاوی کامیابی کا بہترین ذریعہ
سمجھ کر فوراً بغداد جانے کا ارادہ کر لیا مگر ان دنوں ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اتنا روپیہ پاس موجود نہ تھا کہ
سامان سفر کرتے۔ مجبوراً اسی ڈیوڑھی پر آنا پڑا جہاں کرم و عطا میں دوست اور دشمن کی تفریق نہ تھی۔
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پاس آ کر بغداد جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت خوب سمجھتے تھے کہ اس بغداد
کے سفر کی بنیاد کیا ہے۔ حجت تمام کرنے کی غرض سے آپ نے سفر کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے اپنی پریشان
حالی بیان کرتے ہوئے کہا کہ قرضدار بہت ہو گیا ہوں۔ خیال کرتا ہوں کہ شاید وہاں جا کر کوئی صورت
بسر اوقات کی نکلے اور میرا قرضہ ادا ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے

میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا تمام قرضہ ادا کر دوں گا۔ اور جہاں تک ہو سکے گا تمہاری ضروریات زندگی بھی پوری کرتا رہوں گا۔

افسوس ہے کہ محمد نے اس کے بعد بھی بغداد جانے کا ارادہ نہیں بدلا۔ چلتے وقت حضرت سے رخصت ہونے لگے تو عرض کیا کہ مجھے وہاں کے متعلق کچھ ہدایت فرمائی جائے۔ حضرت نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جب انہوں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا "بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے خون میں شریک ہونا اور میرے بچوں کی یتیمی کے باعث نہ ہونا۔" محمد نے اس کے جواب میں بہت کہا کہ یہ بھلا کون سی بات ہے جو مجھ سے کہی جاتی ہے کچھ اور ہدایت فرمائیے۔ حضرت نے اس کے علاوہ کچھ کہنے سے انکار کیا۔ جب وہ چلنے لگے تو حضرت نے ساڑھے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم انہیں مصارف سفر کے لیے عطا فرمائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو حضرت کے پیش نظر تھا۔ محمد ابن اسمٰعیل بغداد پہنچے اور وزیر اعظم یحییٰ برمکی کے مہمان ہوئے۔ اس کے بعد یحییٰ کے ساتھ ہارون کے دربار میں پہنچے۔ مصلحت وقت کی بنا پر بہت تعظیم و تکریم کی گئی۔ اثنائے گفتگو میں ہارون نے مدینہ کے حالات دریافت کیے۔ محمد نے انتہائی غلط بیانیوں کے ساتھ وہاں کے حالات کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ "میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ ہوں۔" اس نے کہا اس کا کیا مطلب۔ محمد نے کہا کہ بالکل اسی طرح جیسے آپ بغداد میں سلطنت کر رہے ہیں۔ موسیٰ کاظم مدینہ میں اپنی سلطنت قائم کیے ہوئے ہیں۔ اطراف ملک سے ان کے پاس خراج پہنچتا ہے اور وہ آپ کے مقابلے کے دعویدار ہیں۔

یہی وہ باتیں تھیں جن کے کہنے کے لیے یحییٰ برمکی نے محمد کو منتخب کیا تھا۔ ہارون کا غیظ و غضب انتہائی اشتعال کے درجہ تک پہنچ گیا۔ اس نے محمد کو دس ہزار دینار عطا کر کے رخصت کیا۔ خدا کا کرنا یہ کہ محمد کو اس رقم سے فائدہ اٹھانے کا ایک دن بھی موقع نہیں ملا۔ اسی شب کو ان کے حلق میں درد پیدا ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہارون

کو یہ خبر پہنچی تو اس نے اشرفیوں کے توڑے واپس منگوا لیے مگر محمد کی باتوں کا اثر اس کے دل پر
ایسا ہو گیا تھا کہ اس نے یہ طے کر لیا کہ امام موسیٰ کاظم کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

چنانچہ ۱۷۹ھ میں پھر ہارون رشید نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور وہاں سے مدینہ منورہ گیا
وہاں ایک دن قیام کے بعد کچھ لوگوں کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا جب یہ
لوگ امام کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت روضۂ رسول پر ہیں۔ ان لوگوں نے روضۂ
پیغمبر کی عزت کا بھی خیال نہ کیا۔ حضرت اس وقت قبر پیغمبر کے نزدیک نماز میں مشغول تھے۔ بے رحم
دشمنوں نے آپ کو نماز کی حالت ہی میں قید کر لیا اور ہارون کے پاس لے گئے۔ مدینہ رسول کے
رہنے والوں کی بے حسی اس سے پہلے بھی بہت دفعہ دیکھی جا چکی تھی۔ یہ بھی اس کی ایک مثال تھی
کہ رسول کا فرزند روضۂ رسول سے اس طرح گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا مگر نام نہاد مسلمانوں میں
ایک بھی ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی آواز احتجاج بلند کرتا۔ یہ ۲۰ شوال ۱۷۹ھ کا واقعہ ہے۔

ہارون نے اس اندیشہ سے کہ کوئی جماعت امام موسیٰ کاظم کو رہا کرانے کی کوشش
نہ کرے دو محملیں تیار کرائیں۔ ایک میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو سوار کیا اور اس کو ایک بڑی
فوجی جمعیت کے حلقہ میں بصرہ روانہ کیا اور دوسری محمل جو خالی تھی اسے بھی اتنی ہی جمعیت کی
حفاظت میں بغداد روانہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کے محل قیام اور قید کی جگہ کو بھی مشکوک بنا دیا
جائے۔ یہ نہایت حسرتناک واقعہ تھا کہ امام کے اہل حرم اور بچے وقت رخصت آپ کو دیکھ بھی
نہ سکے اور اچانک محل سرا میں صرف یہ اطلاع پہنچ سکی کہ حضرت سلطنت وقت کی طرف سے قید کر لیے
گئے۔ اس سے بی بیوں اور بچوں میں جو کہرام برپا ہو گیا اور یقیناً امام کے دل پر بھی اس کا جو صدمہ
ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے مگر آپ کے ضبط و صبر کی طاقت کے سامنے ہر مشکل آسان تھی۔

معلوم نہیں کتنے برس [illegible] یہ سلسلہ چلا گیا تھا کہ پھر ایک مرتبہ [illegible]
کو آپ بصرہ پہنچائے گئے۔ کامل ایک سال تک آپ بصرہ میں قید رہے۔ یہاں کا حاکم بادشاہ کا چچا زاد بھائی
عیسیٰ ابن جعفر تھا۔ شروع میں تو اسے صرف بادشاہ کے حکم کی تعمیل مدنظر تھی بعد میں اس نے غور کرنا
شروع کیا کہ آخر ان کے قید کیے جانے کا سبب کیا ہے اور اس سلسلہ میں اس کو امام کے حالات اور عادات
زندگی اور اخلاق و اوصاف کی جستجو کا موقع بھی ملا۔ اور جتنا اس نے امام کی سیرت کا مطالعہ کیا اتنا
اس کے دل پر آپ کی بلندی اخلاق اور حسن کردار کا اثر قائم ہو گیا۔ اپنے ان تاثرات سے اس نے ہارون کو
مطلع بھی کر دیا۔ ہارون پر اس کا الٹا اثر ہوا کہ آپ عیسیٰ کے متعلق بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اس لیے
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بغداد میں بلا بھیجا اور فضل ابن ربیع کی حراست میں سپرد کیا اور پھر فضل
کا رجحان شیعیت کی طرف محسوس کر کے یحییٰ برمکی کو اس لیے مقرر کیا معلوم ہوتا ہے کہ امام کے اخلاق و
اوصاف کی کشش ہر ایک پر اپنا اثر ڈالتی تھی۔ اس لیے ظالم بادشاہ کو نگرانوں کی تبدیلی کی ضرورت پڑتی تھی۔

وفات: سب سے آخر میں امام سندی ابن شاہک کے قید خانہ میں رکھے گئے یہ شخص
بہت ہی بے رحم اور سخت دل تھا۔ آخر اسی قید میں حضرت کو انگور میں زہر دیا گیا۔ ۲۵ رجب ۱۸۳ھ
میں ۵۵ سال کی عمر میں حضرت کی وفات ہوئی۔ بعد وفات آپ کی لاش کے ساتھ بھی کوئی اعزاز
کی صورت اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ بہت حسرت ناک طریقے پر توہین آمیز الفاظ کے ساتھ اعلان
کرتے ہوئے آپ کی لاش کو قبرستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ مگر اب ذرا عوام میں احساس پیدا ہو گیا
تھا اس لیے کچھ اشخاص نے امام کے جنازے کو لے لیا اور پھر عزت و احترام کے ساتھ
مشایعت کر کے بغداد سے باہر اس مقام پر جو اب کاظمین کے نام سے مشہور ہے دفن کیا۔
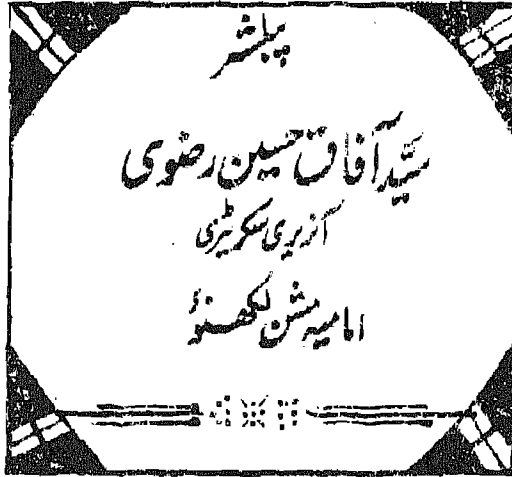
رسالہ نمبر ۱۰۵

امامیہ مشن
لکھنؤ
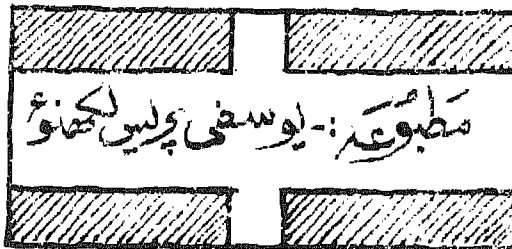
مصنفہ

سید العلماء جناب مولانا
سید علی نقی صاحب قبلہ

قیمت ۲ر محصول ڈاک ـر

تعارف

مرضی الٰہی کے مطابق رسول اسلام کے پیش کیے ہوئے نظام زندگی کو سند سے پھیلانے کیلئے ضرورت تھی کہ کامل ترین شخصیتوں کے ذریعے سے انتہائی صحت و درستی کے ساتھ ایک مدت تک اسے بار بار دہرایا جائے تاکہ کم فہم سے کم فہم انسان تک اس نظام کو اس کی نوک پلک سے سمجھ جائیں۔ اس حد کے اہم کام کی ذمہ داری ہمارے بارہ اماموں کے سپرد کی گئی تھی۔ مگر جس طرح دنیا والے ہمیشہ مصلحین کے دشمن رہے اسی طرح ان معصومین سے بھی مخالفتوں کی انتہا کر دی گئی۔ ان کی پوری پوری زندگیاں جن آلام اور جن مصائب میں گذریں اُن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حکومتوں کے شکنجوں، زمانے کی سختیوں اور مخالف ماحول نے پورے نظام اسلامی کی عام اشاعت مکمل طور نہیں ہونے دی، آئمہ علیہم السلام کی صرف وہ باتیں جو اپنے زمانے کے اعتبار سے بہت ہی عجیب معلوم ہوئیں انھیں کو شہرت عام حاصل ہوئی۔ اس طرح کی جو بات یا جو باتیں جس امام کے زمانہ میں مشہور ہوئیں وہی اُن سے مخصوص کر دی گئیں۔ بالکل اسی طرح امام علی رضا علیہ السلام جن کے مختصر حالات زندگی اس کتاب کا موضوع ہیں آپ کی نمایاں خصوصیت مساوات اسلامی قرار پائی۔

شاہان بنی عباس کے جاہ و جلال، سطوت و جبروت، رعب داب اور تزک و احتشام کے خوگر لوگوں کے لیے ولی عہد سلطنت کا عوام کی پوشاک میں پیادہ خصوصیت سے نماز عید پڑھانے جانا، کہیں اور نہیں خاص شاہی محل میں خادموں اور غلاموں کے ساتھ کھانا کھانا، بڑے چھوٹے میں فرق نہ کرنا، غریبوں سے اتصال رکھنا وغیرہ یقیناً حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہوگا۔

ہمارے کل اماموں کے اصول ایک تھے، مسلک ایک تھا، تعلیمات ایک تھیں، اس لیے کہ فریضہ ایک تھا۔ یہ صرف حکومتوں کی کارفرمائی تھی جن کی وجہ سے ائمہ کرام کے خصوصیات مختلف مشہور ہو گئے۔

خادم ملت

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ایک عملی مذہب ہے اور وہ اس دنیا میں رہ کر دین کے راستے پر قائم رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے اس کا راستہ بال سے زیادہ باریک ہو گیا ہے کیونکہ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر دامن کو بچائے رکھنا کوئی دشوار امر نہیں ہے لیکن انسان کے دنیا کے اندر رہتے ہوئے ہر ہر قدم پر اپنے مالک کی مرضی کو پیش نظر رکھنا اور پھر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبّا نہ آنے دینا بڑا سخت کام ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ان رہنمایان دین کی سیرت زندگی کو غور سے دیکھنے کی جنھیں ہر طرح کے نرم اور گرم حالات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کبھی گوشۂ تنہائی میں زندگی گذارنا پڑی اور کبھی اپنی طبیعت کے خلاف دنیاوی سلطنت کے ماحول اور دنیاوی سیاست کے اندر قدم رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کرتے رہے جس کے لیے وہ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ آل محمدؐ کے سلسلہ کی یہ دسویں کڑی حضرت امام رضا علیہ السلام ہیں کہ جن کے حالات میں ایسی ہی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

نام ونسب

علیؑ نام رضا لقب اور ابوالحسن کنیت۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام والد بزرگوار تھے اور اس لیے آپ کو پورے نام و لقب کے ساتھ یاد کیا جائے تو امام ابوالحسن علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کہا جائے گا۔ والدہ گرامی کی کنیت اُم البنین اور لقب طاہرہ تھا۔ نہایت عبادت گذار بی بی تھیں۔

ولادت

۱۱ ذی القعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں حضرت کی ولادت ہوئی۔ اسی کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵ شوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی۔ اتنے عظیم حادثۂ مصیبت کے بعد جلد ہی اس مقدس مولود کے دنیا میں آ جانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلی محسوس کی گئی۔

تربیت

آپ کی نشو و نما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زیر سایہ ہوئی۔ اور اسی مقدس

ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں - اور پینتیس ۳۵ برس کی عمر پوری ہوئی - اگرچہ آخری چند سال اس مدت کے وہ تھے جب امام موسیٰ کاظم عراق میں قید ظلم کی سختیاں برداشت کر رہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۸ یا ۲۹ برس آپ کو برابر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا -

جانشینی

امام موسیٰ کاظم ع کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس نہ لینے دے گی - اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کے آخری عمر کے حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستان اہلبیت کا آپ سے ملنا یا بعد کے لئے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جائے گا - اس لئے آپ نے اُنہی آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جبکہ آپ مدینہ میں تھے پیرواں اہلبیت کو اپنے بعد ہونے والے امام سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی - چنانچہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں سے سترہ ۱۷ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے اُنہیں جمع فرما کر اپنے فرزند حضرت علیؑ رضا کی وصایت اور جانشینی کا اعلان فرما دیا - اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ ۶۰ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی - یہ اہتمام دوسرے ائمہ ع کے یہاں نظر نہیں آتا، صرف اُن خصوصی حالات کی بنا پر جن سے دوسرے آئمہ ع اپنی وفات کے موقع پر دوچار نہیں ہونے والے تھے -

دور امامت

حضرت امام رضا علیہ السلام کی پینتیس ۳۵ برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم ع کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داریاں آپ کی طرف منتقل ہوئیں - یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون الرشید تخت خلافت پر تھا اور بنی فاطمہ کے لیے حالات بہت ناسازگار تھے - اس ناخوشگوار ماحول میں حضرت نے خاموشی کے ساتھ شریعت حقہ کی خدمات انجام دینا شروع کر دیے -

علمی کمال

آل محمدؐ کے اس سلسلہ میں ہر فرد حضرت احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دی گئی تھی جسے دوست اور

دشمن سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانہ نے کم موقع دیا اور کسی کو زیادہ۔ چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ حضرت امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ "تمہارے بھائی علی رضا عالم آلِ محمدؐ ہیں۔" اپنے دینی مسائل کو ان سے دریافت کر لیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپ مدینہ میں تھے اور روضۂ رسول پر تشریف فرما رہتے تھے تو علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ یقطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے اور آپ نے ان کا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیے تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

زندگی کے مختلف دور

حضرتِ امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا۔ یقیناً وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا جس طرح اس کے پہلے آپ کے والد بزرگوار کا رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے حکومت وقت کی عام بدنامی ہو گئی تھی اور یا واقعی ظالم کو خود اپنی بدسلوکیوں کا احساس اور ضمیر کی طرف سے ملامت کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے کھلم کھلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحییٰ ابن خالد برمکی نے اپنے اثر اور رسوخ کے بڑھانے کے لیے یہ کہا بھی کہ علی ابن موسیٰ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی طرح دعویدار ہیں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے

ان کے باپ کے ساتھ کیا وہی کیا کم ہے جو اب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کر دوں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہلبیت رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو برتاؤ اب تک رہا تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمال حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہلبیت کے ساتھ کوئی اچھا رویہ رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ امام کے پاس آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کے لیے آسکتے تھے۔ نہ حضرت کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے لطفی میں گزرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندان شاہی سے منصور دوانیقی کی پوتی تھی۔ اور اس لیے عرب سردار سب اس کے طرفدار تھے اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ سے تھا۔ اس لیے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ دونوں کی آپس کی رسہ کشی ہارون کے لیے سوہان روح بنی رہتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اس کا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ یوں کر دیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام۔ مصر۔ حجاز۔ یمن وغیرہ محمد امین کے نام کیے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران۔ خراسان۔ ترکستان وغیرہ مامون کے لیے مقرر کیے۔ مگر یہ تصفیہ تو اس وقت کارگر ہو سکتا تھا جب دونوں فریق "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہ کے خلاف ہر طرح کے ظلم و تعدی کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے تو خود بنی عباس میں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرنے پر تیار نظر آئیں۔ اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جبکہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور ایثار اور خلق خدا کی خیر خواہی کا بھی حامل نہیں ہے۔ جیسے بنی فاطمہ اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کر لیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خون ریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدود سلطنت پر قائم ہو گئی۔

ولی عہدی

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے پالے نام ہو گئی۔ مگر یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکان سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ ایک غم و غصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا۔ اولاد فاطمہؑ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے رہے تھے وہ خواہ قتل کر دیے گئے ہوں یا جلا وطن کیے گئے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں۔ ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ نہ بھی سکتی۔ تب بھی دل ہی دل میں حکومت بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ ان مظالم ہی کو یاد دلا کر جو بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے بنی فاطمہ کے ساتھ ہوئے تھے۔ اس سے ایران میں اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ درمیان میں بنی عباس نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا۔ مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی کھلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کہا کیا گیا تھا اور اقتدار کن لوگوں نے حاصل کر لیا۔ ممکن ہے کہ ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچا مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو۔ اب جس وقت کہ امین کے قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا اور اسے ہر وقت اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہؑ کو اپنا بنایا جائے اور چونکہ طرزِ عمل میں خلوص سمجھا نہیں جا سکتا اور وہ عام طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا اگر یہ نمایاں ہو جائے کہ وہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور ولائے اہلبیت کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے "اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک نیتی سے اب "حق بحق دار رسید" کے مقولہ کو سچا بنانا چاہتا ہے

اس سلسلہ میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے تحریر فرمایا ہے اس نے اپنی نذر کی حکایت بھی شائع کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت

نازک حالت تھی اور عین اسی وقت میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہوگئی تھی اور خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور منت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں اور میں خلافت تک پہونچوں تو اس کو اس کے اصلی حقدار یعنی اولاد فاطمہؑ میں سے جو اس کا اہل ہے اُس تک پہونچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی ۔

یقیناً یہ واقعہ مامون کی طرف سے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس کا طرزِ عمل خلوص قلب اور حسن نیت پر مبنی سمجھا جائے ۔ یوں تو اہلبیت کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے وہ بھی ان کی حقیّت اور فضیلت سے واقف تھے اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شیعیت کے معنی صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں ۔ بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعوائے شیعیت اور محبت اہلبیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود امام کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ امام کو اپنے منشاء کے مطابق چلانے کی کوشش تھی ۔ ولی عہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کر دیا گیا اور آپ کو مجبور بنا دیا گیا تھا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ولی عہدی کی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اس وقت شیعیت کے بھیس میں امام کے ساتھ کیا جا رہا تھا

امام علیہ السلام کا اس ولی عہدی کو قبول کرنا ، بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہارون کے حکم سے امام موسیٰ کاظمؑ کا جیل خانہ چلا جانا ۔ اسی لئے جب امام رضاؑ مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو آپ کے رنج صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی روضہ رسول سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے موقع پہ

تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بتیابانہ روضہ کے اندر جاتے ہیں اور نالۂ آہ کے ساتھ امت کی شکایت کرتے ہیں۔ پھر باہر نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں۔ یہی صورت کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرت کے قریب گیا تو فرمایا اسے محول میں اپنے جدِ امجد کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جا رہا ہوں اب مجھکو یہاں واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔

سنہ ۲۰۰ھ میں حضرت مدینہ منورہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوئے اہل وعیال اور متعلقین سب کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ برس کی تھی آپ بھی مدینہ ہی میں رہے (اس سفر کے مختصر حالات اور نیشاپور میں امام کا استقبال اور حضرت کا خطبہ رسالہ عہد مامون اور امام رضاؑ میں جو امامیہ مشن سے شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمائیے)

جب حضرت مرو پہونچے جو اس وقت دارالسلطنت تھا تو مامون نے چند روز ضیافت وتکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبول خلافت کا سوال پیش کیا۔ حضرتؑ نے اس سے اسی طرح انکار کیا جس طرح امیرالمومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت پیش کیے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے۔ مامون کو خلافت سے دست بردار ہونا درحقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امامؑ کو اسی پر مجبور کرتا چنانچہ جب حضرتؑ نے خلافت کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولی عہدی کا سوال پیش کیا۔ حضرت اس کے بھی انجام سے واقف تھے۔ نیز یہ خوشی جابر حکومت کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا آپ کے مذہبی اصول کے خلاف تھا۔ حضرتؑ نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ اس کو منظور نہیں کر سکتے تو اس وقت آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر

موقوف ہو ورنہ حفاظت جان شریعت اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امام نے فرمایا "یہ ہے تو میں مجبوراً قبول کرتا ہوں، مگر کاروبار سلطنت میں بالکل دخل نہ دوں گا، ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائے گا تو نیک مشورہ ضرور دوں گا۔" اس کے بعد یہ ولی عہدی صرف برائے نام سلطنت وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر امام کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو اُن کے پیش رو حضرت علی مرتضیٰ[۴۱] اپنے زمانہ کی با اقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ جس طرح اُن کا کبھی کبھی مشورہ دے دینا اُن حکومتوں کو صحیح و جائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضا علیہ السلام کا اس نوعیت سے ولی عہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ تھی جو اس طرح پوری ہو گئی۔ مگر امام نے اپنے دامن کو سلطنت ظلم کے اقدامات اور نظم و نسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ انھوں نے بہت کچھ درانداز یاں کیں، مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضا سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتا دو۔ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہوئے۔ مگر ظاہر ہے کہ امام کے مقابلے میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہو سکتی تھی۔ مامون کا فیصلہ اٹل تھا۔ اور وہ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اُسے قائل کر سکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم ماہ رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسہ ولی عہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی پھر اور لوگ بیعت سے شرف یاب ہوئے۔ سونے اور چاندی کے سکے سر مبارک پر نثار کیے گئے اور تمام ارکان سلطنت و ملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرت کے نام کا سکہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ درہم و دینار پر حضرت کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکہ چلایا گیا۔ جمعہ کے خطبہ میں حضرت کا نام داخل کیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

مجبوری اور بے لبسی کا نام قناعت یا درویشی۔ "عصمت بی بی از بے چادری" کے مقولہ کے موافق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے مگر ثروت و اقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردانِ خدا کا حصّہ ہے۔ اہلبیتِ معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے اور اکثر یہ حضرات ایسے ہی تھے وہ عموماً اچھے لباس اور شان کے ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی فقیری کو دشمن بے لبسی پر محمول کرکے طعن و تشنیع پر آمادہ ہوتے اور حقانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کر دیا تاکہ ان کی زندگی غریب مسلمانوں کی تسلی کا ذریعہ بنے اور اُن کے لیے نمونہ عمل ہو۔ جیسے امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؑ چونکہ شہنشاہ اسلام مانے جا رہے تھے۔ اس لیے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جس کی مثال دوسرے معصومینؑ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد بنائے گئے تھے جس کے وسعتِ مملکت کے سامنے روم و فارس کا ذکر بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہو گیا تھا۔ جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تھا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ "جا جہاں تجھے برسنا ہو برس۔ بہرحال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔"

حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت کی ولیعہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا کہ دین والے اگر دنیا کو پا جائیں تو ان کا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں امام رضاؑ تو اپنی دینی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زہد اور ترکِ دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنا دیں۔ جتنے تزک و احتشام کے دنیاوی تقاضے زیادہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دُہرا دیا اور علی رضاؑ کے لباس میں علی مرتضیٰؑ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھوانا پسند نہیں کیے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمبل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا، کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان، سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے۔ داب و آدابِ شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر

ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہو جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا "خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حوّا اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اُس کے عمل کے مطابق ہو گی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لیے ہو؟"

اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جزو بن کر جہاں صرف پیغمبرؐ کی طرف ایک قرابت داری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلق خدا پر حکمرانی کا حق دار بنایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم اور فسق و فجور میں بنی اُمیہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں اُن سے آگے بڑھ گئے اور اس کے ساتھ پھر بھی قرابتِ رسولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر بڑا زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا عمل ہے۔

بہ ظاہر صرف ایک شخص کا اظہار فروتنی اور انکسار نفس تھا جو بہر حال ایک اچھی صفت ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریباً ایک صدی کی عباسی سلطنت کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اسلامی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بڑا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی سیرت میں اس کے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ "خدا کی قسم آبا و اجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں۔" حضرت نے فرمایا۔ "میرے آبا و اجداد کو جو شرف حاصل ہوا وہ بھی صرف تقویٰ، پرہیزگاری اور اطاعتِ خدا سے۔" ایک شخص نے کسی دن کہا کہ "واللہ آپ بہترین خلق ہیں۔" حضرت نے فرمایا "اے شخص حلف نہ اُٹھا جس کا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے افضل ہے۔"

ابراہیم ابن عباس کا بیان ہے کہ حضرت فرماتے تھے "میرے تمام لونڈی غلام آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے تئیں محض رسول اللہ کی قرابت کی وجہ سے اس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل نہیں جانتا (حضرت نے اشارہ کیا اپنے ایک غلام کی جانب) ہاں جب عمل خیر بجا لاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہوں گا۔"

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہوں۔ مگر خود حکومت عباسیہ کا فرمانروا یقیناً اتنا کند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے۔ جو امام رضا کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اس کے خاندانی نظام سلطنت پر برابر لگ رہے تھے۔ اس نے تو خیال خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لیے حضرت کو ولی عہد بنایا تھا مگر بہت جلد اسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی زندگی زیادہ عرصے تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یک لخت انقلاب ہو جائے گا اور عباسی سلطنت کا تختہ ہمیشہ کے لیے الٹ جائے گا۔

عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغ حق کے لیے نام حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا، جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے۔ مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ جب امام کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امام یا بحیثیت عالم دین آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ امام روحانی بھی ہیں اور ولی عہد سلطنت بھی۔ اس لیے آپ کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے۔ مرو کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ یہاں آتے ہیں اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دوسروں کو بھی ترغیب و تحریص کی جانے لگی کہ آل محمد کے مصائب کو یاد کرو اور تاثرات

غم کو ظاہر کرو۔"

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ "جو اُس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں اُس کا دل مُردہ نہ ہوگا اُس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔"

تذکرہ امام حسینؑ کے لیے جو مجمع ہو اُس کا نام اصطلاحی طور پر "مجلس" اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کر دیں۔ جن میں کبھی خود ذاکر ہوئے اور دوسرے سامعین جیسے ریان بن شبیب کی حاضری کے موقع پر جو آپ نے مصائبِ امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبداللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اُس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکرِ امام حسینؑ میں اشعار پڑھو وہ ذاکر ہوا اور حضرت سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبل کو حضرت نے بعد مجلس ایک قیمتی حُلّہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حُلّہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے جسم کا اُترا ہوا لباس مرحمت فرمایئے تو حضرت نے اُن کی خوشی پوری کی۔ وہ حُلّہ تو اُنھیں دیا ہی۔ اُس کے علاوہ ایک جُبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقۂ کار کہ اُسے کسی دنیاوی انعام کی خاطر یا معاذاللہ اجرت طے کر کے ذاکری نہیں کرنا چاہیے۔ اور بانیٔ مجلس کا طریقۂ کار کہ وہ بغیر طے کیے ہوئے کچھ بہ طور پیش کش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے۔ دونوں امر ثابت ہیں مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصّہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔

وفات مامون کے توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امام کی جان لینے کا درپے ہو گیا اور وہی خاموش حربہ جو ان معصومین کے ساتھ اس کے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جا چکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگور میں جو بطور تحفہ امام کے سامنے پیش کیے گئے تھے زہر دیا گیا اور اُس کے اثر سے ۱۷ صفر ۲۰۳ھ میں حضرت نے شہادت پائی۔

مامون نے بہ ظاہر بہت رنج و ماتم کا اظہار کیا اور بڑے شان و شکوہ

کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے نزدیک دفن کیا۔
جہاں مشہد مقدس میں حضرت کا روضہ آج تاجداران عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیاوی شہنشاہ۔ ہارون رشید بھی دفن ہے جس کا نام و نشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی
آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۶
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
سرفراز پریس لکھنؤ

تلک الجنۃ التی نورث من عبادنا من کان تقیا

از:-

حضرت سید العلماء مولانا

سید علی نقی صاحب قبلہ
دام ظلہ

تعارف

ہر امام کے زمانہ میں اسلامی بادشاہ نے باوجود دولت و حکومت دینی باتوں میں ہمیشہ اپنے کو تشنک پایا، اور دنیاوی پیشوائی کے ساتھ ساتھ دینی قیادت کبھی نہ حاصل کر سکے۔ اقتدار کے دل پر یہ سبکی ہمیشہ گراں گزرا کی۔ اسی گرانی نے ہمارے ہر امام کی زندگی تلخ کر دی اور ان کو طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ساری عمر مقابلہ کرنا پڑا۔

مامون الرشید بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا، مگر اس نے گزشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر حربے کا رخ بدل دیا۔ اس نے اماموں کو اپنا کر مقصد حاصل کرنے کی مہم جاری کی۔ امام رضا علیہ السلام کے معاملے میں اپنی ناکامی سے مایوس نہیں ہوا۔ اب اس نے امام محمد تقی ع کے بچپن سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس کی کوتاہ فہمی نے آپ کو اپنا سا دنیادار بنانے کی کوششیں شروع کیں، مگر اسے اپنے بنائے ہوئے لائحہ عمل کی ہر منزل پر شکست سے دوچار ہونا پڑا اور آخر میں خفت ہی خفت ہاتھ لگی۔

امام محمد تقی علیہ السلام نے کم سنی میں حیرت میں ڈالنے والے علم و عمل کے جو کارنامے پیش فرمائے ہیں ان کو تسلیم کرنے میں ذرہ برابر شک و شبہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب دنیا کے ہر بلند انسان نے اپنے بچپنے ہی سے ذہانت، ذکاوت اور علم کے محیر العقول کرشمے دکھائے ہیں تو جس کے آٹھ آباء و اجداد مسلسل یکے بعد دیگرے انسان کامل گزرے ہوں اور جس کی ہر پشت کا ہر گھرانا مثالی طور پر بہترین صفات انسانی کا حامل ہو اس کی نویں پشت کی رگ رگ میں خلقی اور فطری طور پر خاندانی خصوصیتوں کو بیٹھا ہوا ہونا ہی چاہیے۔ یہ مختصر رسالہ "نویں امام" اس دعوے کا واضح ثبوت ہے۔

سید آفاق حسین رضوی

آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نویں امام

زندگی ہمیشہ کی پکار رکھتی ہے اگر نوع انسانی کے لیے صحیح نمونہ بن کر سامنے آئی ہو وہ خود تو عمر کے ختم ہونے کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے لیکن اس کے پائیدار نقش جو انسانی دماغوں پر جم گئے ہیں وہ کبھی نہیں مٹتے۔ ایسی ہستیوں کی عمر دیکھنے میں اگر مختصر بھی ہو تو نتیجے کے لحاظ سے اور افادیت پر نظر کرتے ہوئے وہ تاریخ انسانی کا اتنا ہی اہم باب قرار پاتی ہے جتنا زیادہ عمر کو حاصل کر کے کسی انسان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

سلسلہ آلِ محمد میں امام محمد تقی علیہ السلام کی یہی حیثیت ہے کہ آپ کی عمر اگرچہ اپنے پہلے اور بعد کے تمام ائمہ میں سب سے کم ہوئی مگر آپ کے علمی اور عملی خدوخال اور سیرت زندگی کے بلند تعلیمات اتنے ہی اہم ہیں جتنے کسی دوسرے معصوم کے حالات ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حالات اہل بیت اطہار کے سلسلہ کا یہ رسالہ ان ہی بزرگوار کی سیرت لکھنے کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔

نام ونسب

محمدؑ نام ابو جعفر کنیت اور تقی و جواد دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم و لقب کو شریک کر کے آپ امام محمد تقی علیہ السلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت ابو جعفر ہو چکی تھی۔ اس لیے کتابوں میں آپ کو ابو جعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جوادؑ بھی کہا جاتا ہے۔

والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضاؑ تھے اور والدہ معظمہ کا نام سبیکہ یا سکینہ تھا۔

ولادت

۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دارالسلطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تخت حکومت پہ تھا۔

نشوونما اور تربیت

یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو نہایت کم سنی کے زمانے ہی میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ انہیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات میں باپ کی محبت، شفقت اور تربیت کے سایے میں زندگی گذارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا جب حضرت امام رضا علیہ السلام مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ امام محمد تقی علیہ السلام اس وقت سے جو اپنے باپ سے جدا ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا۔ امام محمد تقی سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہو گئی۔ دنیا سمجھتی ہوگی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی اور عملی بلندیوں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے۔ مگر خلق خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کم سن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھ کر بڑے بڑے علما سے فقہ اور حدیث تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور ان سب کو قائل ہو جاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اس وقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم و تربیت کے قائل نہ ہوتے، جس کے بغیر یہ معمہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہو سکتا ہے۔

عراق کا پہلا سفر

جب امام رضا علیہ السلام کو مامون نے

ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اس کی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہ سے روابط قائم کئے جائیں اور اس طرح شیعیان اہلبیت کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص و اتحاد کے مظاہرے کے لئے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کر دی جائے۔ چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضاؑ بالکل اپنے بنائے جا سکیں گے مگر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسول کے ورثہ دار ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے تو اسے اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرت کی زندگی کا خاتمہ کر دے مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعت شیعہ کو اپنے قبضے میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لئے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج و غم کا اظہار کیا تاکہ وہ اپنے دامن کو حضرت کے خون ناحق سے الگ ثابت کر سکے اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کے منسوب ہونے کا کر چکا تھا۔ اس نے اسی مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا اس لئے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دارالسلطنت بغداد میں آ چکا تھا اور اس نے یہ تہیا کر لیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کر دے

علماء سے مناظرہ

بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولی عہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا، امام رضاؑ کی وفات سے ایک

حدتک انہیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور انہوں نے مامون سے اپنے حسب دلخواہ اس کے بھائی مؤتمن کی ولی عہدی کا اعلان بھی کرادیا، جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہو کر جو سبز لباس کا رواج ہو رہا تھا اُسے منسوخ کر کے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کر دی گئی تاکہ بنی عباس کے روایات قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پا چکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لئے پھر تشویش کا باعث بنا، اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آکر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار اختیار کیا وہی ہم کو ناپسند تھا مگر خیر وہ کم از کم اپنے عمر اور اوصاف و کمالات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھے بھی جا سکتے تھے مگر یہ ان کے بیٹے محمد تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اسقدر اس کی عزت کرنا ہرگز خلیفہ کے لئے زیبا نہیں ہے۔ پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہنچا جواب ام الفضل کا نکاح محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمد کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کر لیا ہے کہ اوصاف و کمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لے کر دیکھ لو، پھر تمہیں بھی میرے فیصلے سے متفق ہونا پڑے گا یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی۔ حالانکہ خود مامون تمام سلاطین بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لئے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں: ۔ کان یعد من کبار الفقہاء

یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے اس لیے اس کا فیصلہ خود کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ ابن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیے منعقد کیا اور عام اعلان کروا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک نو برس کا بچہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکان دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماء و فضلاء کے لیے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زرین دور تھا اور بغداد دارالسلطنت تھا جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کھنچکر جمع ہو گئے تھے اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کیلئے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرت کے سامنے یحییٰ بن اکثم کیلئے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہر طرف کامل سناٹا تھا مجمع ہمہ تن چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کیا تھا "حضور کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابو جعفر سے کوئی مسئلہ دریافت کروں"

مامون نے کہا "تم کو خود انہی سے اجازت طلب کرنا چاہیے"

یحییٰ امام کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟"

فرمایا "تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو"

یحییٰ نے پوچھا کہ "حالت احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟" اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا وہ اپنے غرور علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کمسن صاحبزادے تو ہیں ہی روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالت احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امام نے اسکے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب اصل مسئلے کا دیئے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہو گیا یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مجمل ہے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں، شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف، اس نے عمداً اس جانور کو مار ڈالا یا دھوکے سے قتل ہو گیا، وہ شخص آزاد تھا یا غلام، کمسن تھا یا بالغ، پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا، شکار پرند کا تھا یا کوئی اور، چھوٹا تھا یا بڑا، وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے، رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے یہ شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ، احرام عمرہ کا تھا یا حج کا۔ جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتائے جائیں اس مسئلے کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جا سکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہرحال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر تھی وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لئے آسان نہیں ہے اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کر لیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرت سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرما دیجئے تاکہ ہم سب کو استفادہ کا موقع مل سکے۔ امام نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرمائے۔ یحییٰ

ہکا بکا امام کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ مامون کو بھی کد تھی کہ وہ یحییٰ کی ندامت
کو انتہائی درجے تک پہونچا دے۔ اس نے امام سے عرض کیا کہ "اگر مناسب معلوم ہو تو
آپ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔" حضرت نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت فرمایا کہ "کیا
میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا
اپنا اور امام کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا اس لئے طرز گفتگو اس کا اب دوسرا
ہی تھا۔ اس نے کہا کہ "حضور دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہوگا تو عرض کر دوں گا
ورنہ خود حضور ہی سے معلوم کر لوں گا۔" حضرت نے سوال کیا جس کے جواب میں یحییٰ
نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امام نے خود اس سوال کو حل فرما دیا۔
مامون کو اپنی بات کے اونچا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ
"دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے
یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" مجمع میں جوش و خروش تھا۔ سب نے یک زبان
ہو کر کہا کہ بیشک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقیناً ابوجعفر محمد ابن علیؑ
کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور اسی
جلسے میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کر دیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ عموماً
پڑھا جاتا ہے، وہی ہے کہ جو امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا
تھا یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں
بڑی فیاضی سے کام لیا۔ لاکھوں روپیہ خیر و خیرات میں تقسیم کیا گیا۔ اور تمام رعایا کو انعامات و عطایا کے ساتھ مالا مال کیا گیا

مدینہ کی طرف واپسی

شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک امام محمد تقیؑ بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل
کو حضرت کے ساتھ رخصت کر دیا اور امام مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

اخلاق و اوصاف

امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اس بلندی پر تھے
جس کی تکمیل رسولؐ و آل رسولؐ کا طرۂ امتیاز تھی ہر ایک سے

جھک کر ملنا، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا، مساوات اور سادگی کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا، غرباء کی پوشیدہ طور پر خبر لینا، دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مہمانوں کی خاطر داری میں انہماک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لئے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے افراد کا تھا جن کے حالات اس کے پہلے رسالوں میں لکھے جا چکے ہیں۔

اہل دنیا جو آپ کے بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انہیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال طور طریقے کو بدل دے گا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آل رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتے تھے کہ بلندی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لئے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی، اور پھر امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔ فقط ظاہری شکل و صورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا، مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں کی ایک تھی جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولی عہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین

تقریباً آٹھ برس کا ایک بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک قائم ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کے ولی عہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا اس لئے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن سے قصر حکومت میں نشو ونما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوائے ان کم لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا کہ وہ نو برس کا بچہ جسے شہنشاہ اسلام کا داماد بنایا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا ہے تو ایک علیحدہ مکان کرایہ لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں۔ اس سے بھی امام کی مستحکم قوت ارادی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد بھی رہے اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں اس کا قیام رہے، مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت پر مجبور کر دیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے با اقتدار کے لئے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی۔ اور امام مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا نہ پہرے دار نہ کوئی خاص روک ٹوک نہ تزک نہ احتشام نہ اوقات ملاقات نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤ میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبوی میں ہوتی تھی

جہاں مسلمان حضرت کے زمنظ و نصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث اخبار و احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادق علیہ السلام ہی کا جانشین ہے جو اسی مسندِ علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امورِ خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا انہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پروانہ کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہ وقت کی بیٹی ہیں چنانچہ ام الفضل کے ہوتے ہوئے آپ نے حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسل امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی مامون کے دل کے لئے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر نہ تھا مگر اسے اب اپنے کئے کو نباہنا تھا، اس نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ میں نے تمہارا عقد ابو جعفر کے ساتھ اس لئے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلالِ خدا کو حرام کر دوں مجھ سے اب اس قسم کی شکایت نہ کرنا۔

یہ جواب دے کر حقیقت میں اس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی با احترام خاتون ہوئی ہے تو اس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا۔ جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے جناب خدیجہ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لئے جناب فاطمہ زہراؑ۔ مگر شہنشاہِ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لئے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی ہے اسلام کی اُس روح کے خلاف تھا جس کے آل محمدؐ محافظ تھے۔ اس لئے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

تبلیغ و ہدایت

آپ کی تقریر بہت دلکش اور پُر تاثیر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زمانہ حج میں مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر آپ نے احکام شرع کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علما دم بخود اور دنگ رہ گئے

اور انھیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔

امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا۔ اور اسی لئے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں بھی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہو گئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علماء نے آپ سے علوم اہلبیت کی تعلیم حاصل کی آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابیطالب کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

عراق کا آخری سفر

۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا معتصم جو امام رضا کے بعد ولی عہد بنایا جا چکا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی جس طرح کے اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقیؑ علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اسلئے اپنی بات کی پچ اور کئے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ مایوس کر دینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کر دی مگر معتصم کو جو امام رضا کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمائندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا اب ام الفضل کے شکایتی خطوط کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا

حق بجانب ثابت کرتا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی، اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہو جانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا، حاکم مدینہ عبدالملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا، مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند حضرت امام علی نقیؑ اور ان کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔

وفات

بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے آپ کے ساتھ بظاہر کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں کا قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا۔ جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور ۲۹ ذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور اپنے جد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کر کے عربی کے قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحتاً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد یعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحتاً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

رضوی سید

یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ دراصل تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں۔ اگر

حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام محمد تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعہ سے بھی ہوتی تو امتیاز کے لیئے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقیؑ کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی، مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضا کی شخصی شہرت سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لئے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کر کے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی

امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ

سرفراز پریس لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۷

امامیہ مشن لکھنؤ

دسویں امام

مصنفہ

سید العلماء جناب مولانا
سید علی نقی صاحب قبلہ

۲

تعارف

کتاب کا نام ہی بتاتا ہے کہ اس کا موضوع امام علی نقی علیہ السلام کے حالات زندگی ہیں۔ ابھی تک جتنے ائمہ کرام گزرے اُن کے مقابلے میں آپ کو سب سے زیادہ کم سنی میں امامت کے فرائض انجام دینا پڑے۔ آپ کی عمر اپنے والد بزرگوار امام محمد تقی علیہ السلام کے انتقال کے وقت صرف چھ برس پانچ مہینے کی تھی مگر ہر حیثیت سے آپ کی عقل، آپ کا کردار اور آپ کا تدبر اتنا ہی بالغ تھا جتنا کسی زیادہ سے زیادہ عمر کے امام کا تھا۔ اس کا سب سے مضبوط ثبوت یہ ہے کہ اگر کم سنی کی وجہ سے آپ میں معاذ اللہ کسی طرح کی کمیاں ہوتیں تو حکومت وقت اُن سے ضرور فائدہ اٹھاتی۔ وہ چاہے کتنی ہی بے حقیقت اور کتنی ہی ذرا سی بات ہوتی پھر بھی دشمن کے ہاتھ کا قلم رائی کا پہاڑ بنا کر بڑی شدت سے مطعون کرتا مگر دنیا کی تاریخیں شاہد ہیں کہ آپ سے متعلق کسی کمزوری کا نام و نشان تک نہیں رکھ سکیں۔ کمزوری کا بھلا کیسے، مالک ارض و سما اپنے بنائے ہوئے زندگی کے نظام کو جن داعیوں اور جن ہاتھوں سے پھیلانا چاہے وہ جو عالم الغیب ہے، جس نے کائنات عالم کے ذرے ذرے کی تخلیق کی ہے، جس کے سامنے ہر چیز موجود اور جو کچھ جس میں ہے وہ اُسی کا کیا ہوا ہے، وہ اور کل نوع انسانی میں سے چند فردوں کو منتخب کرے۔ اور اس کے انتخاب میں کوئی کمی رہ جائے، اس کا امکان ہی نہیں ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام کو چھ بادشاہوں کے زمانوں سے گزرنا پڑا۔ ہر ایک بادشاہ نے اپنے اپنے زمانے میں آپ سے متعلق اپنے طرز عمل کو مختلف رکھا۔ بعض نے آپ سے کوئی تعرض نہیں کیا، کسی نے قید کر دیا، کسی نے کچھ آسانیاں کر دیں، کسی نے نظر بند کر دیا اور جب ان تشددات سے بھی آپ کے مسلک کی گرانی کم نہ ہوئی تو آخر میں اُسی حربے سے کام لیا گیا جو تقریباً ہر امام کے خلاف استعمال کیا گیا تھا، یعنی زہر دے کر آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ حکمرانوں کا یہ عمل حقیقت میں اُن کی حد سے سوا شکست کا ثبوت ہے۔ وہ زہر دے کر اماموں کی زندگیوں کو تو ختم کر دیتے تھے مگر خدا کی قسم اُن کو اپنی بے انتہا بے بسی اور بے چارگی کا احساس بھی ضرور ہوتا ہوگا کہ ایک تنہا انسان جس کا بظاہر کوئی دوست مددگار نہیں ہے اُس پر ہم قابو نہ پا سکے، اُس کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہ بنا سکے، جس کے مقابلے میں ہماری ہر طرح کی لامحدود طاقتیں بے حقیقت ہو کر رہ گئیں اور اپنا رنگ رنگ کا انس کھو بیٹھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ چاہے تھوڑے ہی زمانہ کے لیے سہی مگر انھیں اپنے سے بہت بالا بلند ایک خدائی طاقت کا خیال بھی یقیناً ہوتا ہوگا۔ حکومت کے نشے سے سرشار قوت کے پجاری دماغوں میں یہ احساس پیدا کرانا ہمارے ائمہ کا کیا کم بڑا کارنامہ ہے۔

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری
۱۹؍ فروری [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

آلِ رسولؐ میں سے ہر ایک فرد جو مسلمانوں کی سچی رہنما بن سکتی تھی اپنے زمانہ کی مادّی سلطنت کے ظلم و تعدی کا نشانہ رہی۔ اس کے باوجود انھوں نے شریعتِ اسلام کی حفاظت و حمایت کے فرض میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور سخت سے سخت حالات میں بھی قدمِ استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ اسی لیے اُن میں سے ہر ایک بزرگ کی بسر زندگی عملی دنیا میں ہمارے دل میں ہمت، عزم میں پختگی اور قدم میں استقلال پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ بالخصوص ایسے وقت جب کہ ہر طرف سے تباہیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر چھا رہی ہیں اور ہمارے آرام، سکون اور زندگی تک کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ ایسے رہنمایانِ دین کے حالاتِ زندگی کے پیش ہونے کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اسی لیے "دسویں امام" کے حالات میں یہ رسالہ تحریر کیا جا رہا ہے۔

نام و نسب | اسم مبارک علی، کنیت، ابوالحسن اور لقب نقی ہے۔ چونکہ آپ سے پہلے حضرت علی مرتضیٰؑ اور امام رضاؑ کی کنیت ابوالحسن ہو چکی تھی اس لیے آپ کو "ابوالحسن ثالث" کہا جاتا ہے۔ والدہ معظمہ آپ کی سمانہ خاتون تھیں۔

ولادت اور نشوونما

۵ رجب ۲۱۴ھ مدینۂ منورہ میں ولادت ہوئی۔ صرف چھ برس اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔ اس کے بعد اس کمسنی کے عالم میں آپ اپنے والد بزرگوار سے جدا ہو گئے۔ امام محمد تقیؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور وہیں ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۲۲۰ھ میں حضرت کی وفات ہو گئی جس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں امام علی نقیؑ کے کاندھے پر آ گئیں۔ اس صورت میں سوائے قدرت کی آغوش تربیت کے اور کون گہوارہ تھا جسے آپ کے علمی اور عملی کمال کی بلندیوں کا مرکز سمجھا جا سکے۔

انقلابات سلطنت

حضرت امام علی نقیؑ کا دور امامت معتصم عباسی کے زمانۂ سلطنت سے شروع ہوا۔ سنہ ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہوا اور واثق باللہ کی حکومت شروع ہوئی۔ سنہ ۲۳۲ھ میں واثق دنیا سے رخصت ہوا اور مشہور ظالم و سفاک، دشمن اہلبیت متوکل تخت حکومت پر بیٹھا۔ سنہ ۲۴۷ھ میں متوکل ہلاک ہوا اور منتصر باللہ خلیفہ تسلیم کیا گیا جو صرف چھ مہینہ سلطنت کرنے کے بعد مر گیا۔ مستعین باللہ کی سلطنت قائم ہوئی۔ سنہ ۲۵۲ھ میں مستعین کو حکومت سے دست بردار ہو کر جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اور معتز باللہ بادشاہ ہوا یہی امام علی نقیؑ کے زمانے کا آخری بادشاہ ہے۔

آلام و مصائب

معتصم نے خواہ اپنی ملکی پریشانیوں کی وجہ سے جو اسے رومیوں کی جنگ اور بغداد کے دار السلطنت میں عباسیوں کے فساد وغیرہ کی وجہ سے درپیش تھیں اور خواہ امام علی نقیؑ کی کم سنی کا خیال کرتے ہوئے بہرحال حضرت سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آپ سکون و اطمینان کے ساتھ مدینہ منورہ میں اپنے فرائض پورے کرنے میں مصروف رہے۔

معتصم کے بعد واثق نے بھی آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مگر متوکل کا

تخت سلطنت پر بیٹھا تھا کہ امام علی نقیؑ پر تکالیف و مصائب کا سیلاب اُمنڈ آیا یہ واثق کا بھائی اور معتصم کا بیٹا تھا اور آلِ رسول کی دشمنی میں اپنے تمام آباؤ اجداد سے بڑھا ہوا تھا۔

اس سولہ برس میں کہ جب سے امام علی نقیؑ منصب امامت پر فائز ہوئے تھے آپ کی شہرت تمام ممالکِ اسلامی میں پھیل چکی تھی اور تعلیمات اہلبیتؑ کے پروانے اس شمع ہدایت پر برابر ٹوٹ رہے تھے ابھی متوکل کی سلطنت کو چار برس ہوئے تھے کہ مدینہ کے حاکم عبداللہ بن حاکم نے امام سے مخالفت کا آغاز کیا۔ پہلے تو خود حضرت کو مختلف طرح کی تکلیفیں پہنچائیں پھر متوکل کو آپ کے متعلق اسی طرح کی باتیں لکھیں جیسی سابق سلاطین کے پاس آپ کے بزرگوں کی نسبت اُن کے دشمنوں کی طرف سے پہنچائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت اپنے گرد و پیش اسباب سلطنت جمع کر رہے ہیں آپ کے ماننے والے اتنی تعداد میں بڑھ گئے ہیں کہ آپ جب چاہیں حکومت کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں

حضرت کو اس تحریر کی بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ نے اتمام حجت کے طور پر اسی کے ساتھ متوکل کے پاس اپنی جانب سے ایک خط تحریر فرما دیا جس میں حاکم مدینہ کی اپنے ساتھ ذاتی مخالفت کا تذکرہ اور اس کی غلط بیانیوں کا اظہار فرمایا تھا۔ متوکل نے از راہ سیاست امام علی نقیؑ کے خط کو وقعت دیتے ہوئے مدینہ کے اُس حاکم کو معزول کر دیا۔ مگر ایک فوجی رسالے کو یحییٰ بن ہرثمہ کی قیادت میں بھیج کر حضرت سے بظاہر دوستانہ انداز میں باصرار یہ خواہش کی کہ آپ مدینہ سے دارالسلطنت سامرہ تشریف لا کر کچھ دن قیام فرمائیں اور پھر واپس تشریف لے جائیں۔

امام علیہ السلام اس التجا کی حقیقت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے
یہ نیاز مندانہ دعوتِ تشریف آوری حقیقت میں جلاوطنی کا حکم ہے مگر انکار کا کوئی حاصل نہ
تھا جب کہ انکار کے بعد اسی طلبی کے انداز کا دوسری شکل اختیار کر لینا یقینی اور اس کے بعد روانگی
ناگزیر ہے بے شک مدینہ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا آپ کے قلب کے لیے ویسا ہی تکلیف دہ ایک
صدمہ تھا جیسے اس کے پہلے حضرت امام حسینؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام رضاؑ اور امام محمد تقی علیہ السلام
آپ کے مقدس اور بلند مرتبہ اجداد برداشت کر چکے تھے۔ وہ اب آپ کے لیے ایک میراث
بن چکا تھا پھر بھی دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے تاثرات
اتنے شدید تھے جس سے احباب و اصحاب میں ایک کہرام برپا تھا۔

متوکل کا عریضہ بارگاہ امام میں بڑے اخلاص اور اشتیاق قدم بوسی کا مظہر تھا۔ فوجی دستہ
ضرور بھیجا گیا تھا۔ مگر وہ بظاہر سواری کے تزک و احتشام اور امام کی حفاظت کا
ایک سامان تھا۔ مگر جب حضرت سامرے میں پہنچ گئے اور متوکل کو اس کی اطلاع دی گئی
تو پہلا ہی اس کا افسوسناک رویّہ یہ تھا کہ بجائے امام کے استقبال یا کم از کم اپنے یہاں بلا کر
ملاقات کرنے کے اس نے حکم دیا کہ حضرت کو "خان الصعالیک" میں اتارا جائے۔ اس لفظ کے
معنی ہی ہیں "بھیک مانگنے والے گداؤں کی سرا" اس سے اس جگہ کی نوعیت کا پورے طور
پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ شہر سے دور ویرانے میں ایک کھنڈر تھا جہاں امام کو فروکش
ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اگرچہ یہ مقدس حضرات خود فقرا کے ساتھ ہم نشینی کو اپنے لیے عار و ننگ
نہیں سمجھتے تھے اور تکلفات ظاہری سے کنارہ کش رہتے تھے مگر متوکل کی نیت تو اس طرزِ عمل
سے بہرحال تحقیر کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ تین دن تک حضرت کا قیام یہاں رہا اس کے بعد متوکل
نے آپ کو اپنے حاجب زرّافی کی حراست میں نظر بند کر دیا اور عوام کے لیے آپ سے ملنے جانے

کو ممنوع قرار دیا۔

وہ بے گناہی اور حقانیت کی کشش جو امام موسیٰ کاظمؑ کی قید کے زمانہ میں سخت سے سخت محافظین کو کچھ دن کے بعد آپ کی رعایت پر مجبور کر دیتی تھی اسی کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد زراقی کے دل پر امام علی نقیؑ کی عظمت کا سکہ قائم ہو گیا اور وہ آپ کو تکلیف دینے کے بجائے آرام و راحت کے سامان بہم پہونچانے لگا۔ مگر یہ بات متوکل سے زیادہ عرصہ تک چھپ نہیں سکتی تھی۔ اُسے علم ہو گیا اور اس نے زراقی کی قید سے نکال کر حضرت کو ایک دوسرے شخص سعید کی حراست میں دے دیا۔ یہ شخص بے رحم اور امام کے ساتھ سختی برتنے والا تھا اسی لیے اس کے تبادلے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اور حضرت پورے بارہ[12] برس اس کی نگرانی میں مقید رہے۔ ان تکالیف کے ساتھ جو اس قید میں تھے حضرت شب و روز عبادت الٰہی میں بسر کرتے تھے۔ دن بھر روزہ رکھنا اور رات بھر نمازیں پڑھنا معمول تھا آپ کا جسم کتنے ہی قید و بند میں رکھا گیا ہو مگر آپ کا ذکر چار دیواری میں محصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ آپ تو تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید تھے مگر آپ کا چرچا سامرے بلکہ بغداد عراق کے ہر گھر میں تھا اور اس بلند سیرت و کردار کے انسان کو قید رکھنے پر خلق خدا میں متوکل کے مظالم سے نفرت برابر پھیلتی جا رہی تھی۔

اب وہ وقت آیا کہ فتح ابن خاقان باوجود آل رسول سے محبت رکھنے کے صرف اپنی قابلیت اپنے تدبر اور اپنی دماغی و عملی صلاحیتوں کی بنا پر متوکل کا وزیر ہو گیا تو اس کے کہنے سننے سے متوکل نے امام علی نقیؑ کی قید کو نظر بندی سے تبدیل کر دیا اور آپ کو ایک زمین دے کر مکان تعمیر کرنے اور اپنے ذاتی مکان میں سکونت کی اجازت دے دی۔ مگر اس شرط سے کہ آپ سامرے سے باہر نہ جائیں گے اور سعید آپ کے نقل و حرکت اور مراسلات و ملاقات

کی نگرانی سپرد ہوگا۔

اس دور میں بھی امام کا استغنائے نفس دیکھنے کے قابل تھا باوجود دارالسلطنت میں مستقل طور پر قیام کے نہ کبھی متوکل کے سامنے کوئی درخواست پیش کی، نہ کبھی کسی قسم کے ترحم یا تکریم کی خواہش ظاہر کی۔ وہی عبادت و ریاضت کی زندگی جو قید کے عالم میں تھی اس نظر بندی کے دور میں بھی رہی جو کچھ تبدیلی ہوئی تھی وہ ظالم کے رویہ میں تھی مظلوم کی شان جیسے پہلے تھی۔ ویسی ہی اب بھی قائم رہی اس زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ امام کو بالکل آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے دی جاتی۔ مختلف طرح کے تکالیف سے آپ کو دوچار ہونا پڑتا تھا جسمانی سے زیادہ روحانی ہوتے تھے مثلاً یہ کہ آپ کے مکان کی تلاشی لی گئی کہ وہاں اسلحہ ہیں یا ایسے خطوط ہیں جن سے حکومت کی مخالفت کا ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی چیز ملی نہیں۔ مگر یہ تلاشی ہی ایک بلند اور بے گناہ انسان کے لیے کتنی باعث تکلیف چیز ہے اس سے بڑھ کر یہ واقعہ کہ دربار شاہی میں عین اس وقت آپ کی طلبی ہوتی ہے جب کہ شراب کے دور چل رہے ہیں، متوکل اور تمام حاضرین دربار طرب و نشاط میں غرق ہیں، اس پر طرہ یہ کہ سرکش، بے غیرت اور جاہل بادشاہ حضرت کے سامنے جام شراب بڑھا کر پینے کی درخواست کرتا ہے۔

شریعت اسلام کے محافظ معصوم کو اس سے جو تکلیف پہنچ سکتی ہے وہ تیر و خنجر سے یقیناً زیادہ ہے مگر حضرت نے نہایت متانت اور صبر و سکون کے ساتھ فرمایا کہ مجھے اس سے معاف کیجیے، میرا اور میرے آباؤ اجداد کا خون اور گوشت اس سے کبھی مخلوط نہیں ہوا ہے۔"

اگر متوکل کے احساسات میں کچھ بھی زندگی باقی ہوتی تو وہ اس معصومانہ مگر پُرشکوہ

جواب کا اثر ضرور قبول کرتا مگر اس نے کہا کہ اچھا یہ نہیں تو کچھ گانا ہی ہم کو سنائیے۔

حضرت نے فرمایا "میں اس فن سے بھی واقف نہیں ہوں"۔

آخر اس نے کہا کہ آپ کو کچھ اشعار جس طریقے سے بھی آپ چاہیں بہرحال پڑھنا ضرور پڑیں گے۔

کوئی جذبات کی رو میں بہنے والا انسان ہوتا تو اس خفیف الحرکات بادشاہ کے ان حقارت انگیز یا تمسخر آمیز برتاؤ سے متاثر ہو کر شاید اپنے توازن دماغی کو کھو دیتا مگر وہ کوہ حلم و وقار امام کی ہستی تھی جو اپنے کردار کو فرائض کی مطابقت سے تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔ منہیات کے دائرہ سے نکل کر جب فرمائش اشعار سنانے تک پہنچی تو امام نے موعظہ و تبلیغ کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے دل سے نکلی ہوئی پر درد آواز سے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے جنہوں نے محفل طرب میں مجلس موعظہ کی شکل پیدا کر دی:۔

باتوا على قلل الاجبال تحرسهم — غلب الرجال فما اغنتهم القلل

رہے پہاڑوں کی چوٹی پہ پہرے بٹھلا کر — بہادروں کی حراست میں بچ سکے نہ مگر

واستنزلوا بعد عز من معاقلهم — الى مقابرهم يا بئس ما نزلوا

بلند قلعوں کی عزت سے پست ہو کے رہے — تو کنج قبر میں منزل ملی کیا بری پائی

ناداهم صارخ من بعد ما دفنوا — اين الاسرة والتيجان والحلل

صدا یہ ان کو دی ہاتف نے بعد دفن کے — کہاں ہیں تخت وہ تاج اور وہ لباس حسیں

اين الوجوه التي كانت منعمة — من دونها تضرب الاستار والكلل

کہاں وہ چہرے ہیں جو تھے ہمیشہ زیر نقاب — غبار جن پہ کبھی آنے دیتے تھے نہ حجاب

فافصح القبر عنهم حين ساءلهم — تلك الوجوه عليها الدود تنتقل

زبانِ حال سے بولے جواب میں مدفن — وہ رخ زمین کے کیڑوں کا بن گئے مسکن

قد طال ما اکلوا فیھا و قد شربوا — فاصبحوا بعد طول الاکل قد اکلوا

غذائیں کھائیں، شرابیں جو پی تھیں حد سے سوا — نتیجہ اُس کا یہی خود آج بن گئے وہ غذا

اشعار کچھ ایسے حقیقی تاثرات کے ساتھ امام کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ متوکل
کے عیش و نشاط کی بساط الٹ گئی شراب کے پیالے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور تمام مجمع زار و قطار
رونے لگا۔ یہاں تک کہ خود متوکل ڈاڑھیں مار مار کر بے اختیار رو رہا تھا۔ جوں ہی ذرا
رونا موقوف ہوا اُس نے امام کو رخصت کر دیا اور آپ اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔

ایک اور نہایت شدید روحانی تکلیف جو امام کو اس دور میں پہنچی وہ متوکل کے متشددانہ
احکام تھے جو نجف اور کربلا کے زائرین کے خلاف اُس نے جاری کیے تھے۔ اس نے بحکم عام
تمام قلمرو حکومت میں جاری کر دیا کہ کوئی شخص جناب امیر اور امام حسینؑ کے روضوں کی زیارت
کو نہ جائے جو بھی اس حکم کی مخالفت کرے گا اُس کا خون حلال سمجھا جائے گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے حکم دیا کہ نجف اور کربلا کی عمارتیں بالکل گرا کر زمین کے برابر
کر دی جائیں، تمام مقابر کھود ڈالے جائیں، اور قبر امام حسینؑ کے گرد و پیش کی تمام زمین
پر کھیت بو دیے جائیں۔ یہ ناممکن تھا کہ زیارت کے امتناعی احکام پر اہلبیت رسول کے
جاں نثار آسانی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں ہزاروں
بے گناہوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی نظر آئیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ
ان میں سے ہر ایک مقتول کا صدمہ امام کے دل پر اتنا ہی ہوتا تھا۔ جتنا کسی
اپنے ایک عزیز کے بے گناہ قتل کیے جانے کا حضرت کو ہو سکتا تھا۔

پھر آپ ظلم و تشدد کے ایک ایسے ماحول میں گھیر رکھے گئے تھے کہ آپ وقت کی

مناسبت کے لحاظ سے ان لوگوں تک کچھ مخصوص ہدایات بھی نہیں پہنچا سکتے تھے جو اُن
کے لیے صحیح فرائض شرعیہ کے ذیل میں اس وقت ضروری ہوں۔ یہ افسوسناک صورت
حال ایک دو برس نہیں بلکہ متوکل کی زندگی کے آخری وقت تک برابر قائم رہی۔
اور سُنیے کہ متوکل کے دربار میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی نقلیں کی جاتی تھیں
اور اُن پر خود متوکل اور تمام اہلِ دربار ٹھٹھے لگاتے تھے۔
یہ ایسا اہانت آمیز منظر ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ خود متوکل کے بیٹے سے رہا نہ گیا اُس
نے متوکل سے کہا کہ خیر آپ اپنی زبان سے حضرت علیؑ کے بارے میں کچھ الفاظ استعمال کریں تو کریں
مگر جب آپ اپنے کو اُن کا عزیز قرار دیتے ہیں تو ان کم بختوں کی زبان سے حضرت علیؑ کے خلاف
ایسی باتوں کو کیونکر گوارا کرتے ہیں۔ اس پر بجائے کچھ اثر لینے کے متوکل نے اپنے بیٹے کا فحش آمیز
تمسخر کیا۔ اور دو شعر نظم کرکے گانے والوں کو دیے جن میں خود اس کے فرزند کے لیے
ماں کی گالی موجود تھی۔ گویے ان شعروں کو گاتے تھے اور متوکل قہقہے لگاتا تھا۔
اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں ہے۔ ابن السکیت بغدادی علم نحو و
لغت کے امام مانے جاتے تھے اور متوکل نے اپنے دو بیٹوں کی تعلیم کے لیے انھیں مقرر کیا تھا
ایک دن متوکل نے ان سے پوچھا کہ تمھیں میرے ان دونوں بیٹوں سے زیادہ محبت ہے
یا حسنؑ و حسینؑ سے۔ ابن السکیت زمانے کی مجبوریوں سے متوکل کے نوکر ضرور تھے مگر دل میں محبت
اہلبیتؑ کی رکھتے تھے۔ اس سوال کو سن کر بیتاب ہو گئے اور انھوں نے متوکل کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر بے دھڑک کہہ دیا کہ حسنؑ و حسینؑ کا کیا ذکر مجھے تو علی کے غلام
قنبر کے ساتھ ان دونوں سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ بس اس جواب کا سننا تھا کہ متوکل غصے
سے بے خود ہو گیا۔ حکم دیا کہ ابن السکیت کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ یہی ہوا۔ اور

اس طرح یہ آلِ رسول کے فدائی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ان واقعات کا براہ راست جسمانی طور پر حضرت امام علی نقیؑ سے تو کوئی تعلق نہ تھا مگر سچ یہ ان میں کی ہر ہر بات ایک تلوار کی دھار تھی جو گلے پر نہیں، دل پر چلا کرتی تھی متوکل کا ظالمانہ رویہ ایسا تھا جس سے کوئی بھی دور یا نزدیک کا شخص اس سے خوش یا مطمئن نہیں تھا حد یہ ہے کہ اُس کی اولاد تک اُس کی جانی دشمن ہو گئی تھی چنانچہ اسی کے بیٹے منتصر نے اُس کے بڑے مخصوص غلام باغر رومی کو ملا کر خود متوکل ہی کی تلوار سے عین اس کی خوابگاہ میں اُس کو قتل کرا دیا جس کے بعد خلائق کو اُس ظالم انسان سے نجات ملی اور منتصر کی خلافت کا اعلان ہو گیا۔

منتصر نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی اپنے باپ کے متشددانہ احکام کو یک سخت منسوخ کر دیا نجف اور کربلا کی زیارت کے لیے عام اجازت دے دی اور ان مقدس روضوں کی کسی حد تک تعمیر کرا دی۔ امام علی نقیؑ کے ساتھ بھی اس نے کسی خاص تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مگر منتصر کی عمر طولانی نہیں ہوئی وہ چھ ہی مہینے کے بعد دنیا سے اُٹھ گیا۔ منتصر کے جانشینوں کی طرف سے امام کے خلاف کسی خاص بدسلوکی کا پتا نظر نہیں آتا۔

امام علیہ السلام نے چونکہ مکان بنا کر مستقل قیام اختیار فرما لیا تھا اس لیے یا تو خود آپ ہی نے مناسب نہیں سمجھا یا پھر ان بادشاہوں کی طرف سے آپ کے مدینہ واپس جانے کو پسند نہ کیا گیا ہو بہرحال جو بھی وجہ ہو۔ تمام آپ کا سامرہ ہی میں رہا۔ اتنے عرصہ تک حکومت کی طرف سے مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے علوم اہلبیتؑ کے طلب گار زر را الطمینان کے ساتھ کثیر تعداد میں آپ سے استفادہ کے لیے جمع ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے معتمد کے بعد معتمد کو پھر آپ سے پرخاش پیدا ہوئی اور اس نے آپ کی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔

اخلاق و اوصاف

حضرت کی سیرت زندگی اور اخلاق و کمالات وہی تھے جو اس سلسلۂ عصمت کی ہر فرد کے اپنے اپنے دور میں امتیازی طور پر مشاہدہ میں آتے رہے تھے۔ قید خانے اور نظربندی کا عالم ہو یا آزادی کا زمانہ ہر وقت اور ہر حال میں یاد الٰہی، عبادت، خلق خدا سے استغنا، ثبات قدم، صبر و استقلال، مصائب کے ہجوم میں ماتھے پر شکن نہ ہونا، دشمنوں کے ساتھ بھی حلم و مروت سے کام لینا محتاجوں اور ضرورت مندوں کی امداد کرنا یہی اوصاف ہیں جو امام علی نقیؑ کی سیرت زندگی میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

قید کے زمانے میں جہاں بھی آپ رہے آپ کے مصلے کے سامنے ایک قبر کھدی ہوئی تیار رہتی تھی۔ دیکھنے والوں نے جب اس پر حیرت و دہشت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا میں اپنے دل میں موت کا خیال قائم رکھنے کے لیے یہ قبر اپنی نگاہوں کے سامنے تیار رکھتا ہوں۔ حقیقت میں یہ ظالم طاقت کو اس کے باطل مطالبۂ اطاعت اور اسلام کے حقیقی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے ترک کر دینے کی خواہش کا ایک خاموش اور عملی جواب تھا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ سلاطین وقت کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ جان کا لے لینا۔ مگر جو شخص موت کے لیے اتنا تیار ہو کہ ہر وقت کھدی ہوئی قبر اپنے سامنے رکھے وہ ظالم حکومت سے ڈر کر سر تسلیم خم کرنے پر کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بنیادی سازشوں میں شرکت یا حکومت وقت کے خلاف کسی بے محل اقدام کی تیاری سے آپ کا دامن اس طرح بری رہا کہ باوجود دارالسلطنت کے اندر مستقل قیام اور حکومت کے سخت ترین جاسوسی نظام کے کبھی آپ کے خلاف کوئی الزام صحیح نہیں ثابت ہو سکا اور کبھی سلاطین وقت کو کوئی دلیل آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی نہ مل سکی باوجودیکہ سلطنت عباسیہ کی بنیادیں اس وقت اتنی کھوکھلی ہو رہی تھیں کہ دارالسلطنت

میں ہر روز ایک نئی سازش کا فتنہ کھڑا ہوتا تھا۔

متوکل سے خود اُس کے بیٹے منتصر کی مخالفت، اور اُس کے انتہائی عزیز غلام باغر رومی کی اُس سے دشمنی۔ منتصر کے بعد امرائے حکومت کا انتشار۔ اور آخر متوکل کے بیٹوں کو خلافت سے محروم کرنے کا فیصلہ۔ مستعین کے دورِ حکومت میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید علوی کا کوفہ میں خروج۔ اور حسن بن زید الملقب بہ داعی الحق کا علاقۂ طبرستان پر قبضہ کر لینا اور مستقل سلطنت قائم کر لینا۔ پھر دار السلطنت میں ترکی غلاموں کی بغاوت۔ مستعین کا سامرہ کو چھوڑ کر بغداد کی طرف بھاگنا اور قلعہ بند ہو جانا۔ آخر کو حکومت سے دست برداری پر مجبور ہونا اور کچھ عرصہ کے بعد معتز باللہ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اترنا۔ پھر معتز باللہ کے دور میں رومیوں کا مخالفت پر تیار رہنا۔ معتز باللہ کو خود اپنے بھائیوں سے خطرہ محسوس ہونا اور مؤید کی زندگی کا خاتمہ اور موفق کا بصرہ میں قید کیا جانا۔

ان تمام ہنگامی حالات، ان تمام شورشوں ان تمام بے چینیوں اور جھگڑوں میں سے کسی میں بھی امام علی نقیؑ کی شرکت کا شبہ تک نہ پیدا ہونا کیا اُس طرزِ عمل کے خلاف نہیں ہے جو ایسے موقعوں پر جذبات سے کام لینے والے انسانوں کا ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسے اقتدار کے مقابلے میں جسے نہ صرف وہ حق و انصاف کی رو سے ناجائز سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے ہاتھوں اُنھیں جلا وطنی، قید اور اہانتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ مگر وہ جذبات سے بلند اور عظمتِ نفس کا کامل مظہر دنیاوی ہنگاموں اور وقت کے اتفاقی موقعوں سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اپنے لوث حقانیت اور کردار سے بھی گراں صداقت کے خلاف سمجھتا ہے اور مخالف پر پس پشت سے حملہ کرنے کو اپنے بلند نقطۂ نگاہ اور معیارِ عمل

کے خلاف جانتے ہوئے ہمیشہ کنارہ کش رہتا ہے۔

وفات

معتز باللہ کے دور میں تیسری رجب ۲۵۴ھ کو سامرے میں آپ نے رحلت فرمائی۔ اس وقت آپ کے پاس صرف آپ کے فرزند امام حسن عسکری علیہ السلام موجود تھے۔ آپ ہی نے اپنے والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے فرائض انجام دیے اور اسی مکان میں جس میں حضرت کا قیام تھا۔ ایوان خاص میں آپ کو دفن کر دیا۔ وہیں اب آپ کا روضہ بنا ہوا ہے۔ اور عقیدت مند زیارت سے شرف یاب ہوتے ہیں۔

۱۶

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی

(آنریری سکریٹری)

امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ

یوسفی پریس لکھنؤ

رسالہ نمبر ۴۰۱

امامیہ مشن لکھنؤ

حسن عسکریؑ
مصنفہ
سرکار سید العلماء مولانا
سید علی نقی صاحب قبلہ

۲
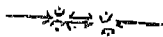
تعارف

حکومت الٰہیہ کی ترویج وہی بزرگ و بلند ہستیاں کر سکتی تھیں جن کے عزم و استقلال کے سامنے پہاڑوں کو اپنی جگہ چھوڑ دینا پڑے، جن کے آگے زر و جواہر کے انبار راہ چلتے ٹھوکر میں آنے والے پتھروں سے بھی کم حقیقت ہوں، جن کی نظروں میں بڑی سے بڑی طاقتیں ایک مفلوج سے بھی کم وقعت رکھتی ہوں۔ جو نخوت و پندار کے دماغوں کو اپنے نیک اور سچے عملوں سے نڈری کے ساتھ ایسی ایسی ٹھوکریاں دیں کہ ان کا بھیجا الٹ پلٹ ہو جائے، جن کی کہی ہوئی باتیں سب طرح کی تو تبدیل کر کبھی بدلی نہ جا سکیں۔ ایسی ہی بلند شخصیتوں میں سے ایک شخصیت ہمارے گیارہویں امام حسن عسکری علیہ السلام کی تھی۔ یہ مختصر کتاب آپ ہی کے سوانح حیات کی آئینہ دار ہے۔

اٹھائیس برس کی زندگی ہی کیا، پھر وہ بھی زیادہ تر مقید، اس پر بھی جس طرح بن پڑا ایمان والوں کو الٰہی مسلک کے مطابق چلاتے، دین کو پھیلاتے اور علم کو بڑھاتے رہے۔ آپ کی مختصر زندگی نے تین مختلف بادشاہوں کے دورِ حکومت دیکھے۔ ہر بادشاہ نے اپنے کو بدلیں اور لاچار پا کے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو قید کیا ہوا رکھا جائے۔ جب اس قید و بند پر بھی آپ کی علمی اور روحانی شہرت بڑھتی ہی گئی تو معتمد باللہ عباسی نے زہر کے ذریعہ سے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہی دنیا کی فطرت عموماً ہر پابندی سے آزاد اور عوام کے ساتھ ہمدردی کرنے سے کوسوں دور رہتی ہے۔ ماسوا رعایا کے لیے اگر کبھی کچھ آسانیاں فراہم بھی کرتا ہے تو اس سے زیادہ تر کسی اپنے مقصد کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ دولت و ثروت، سطوت و جبروت، جبر و تشدد، تیر و تلوار کی طاقت سے عوام کا سر جھکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس کے مزاج میں خدمتِ خلق، مساوات، نیکی، سچائی، ہمدردی، انصاف، رحم، بخشش، درگزر اور اسی طرح کے بہترین صفات حقیقی معنوں میں نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان صفات کے حامل اور معلم ائمہ کی طرف عوام کے دل جھکتے تھے اور یہی وہ باتیں تھیں جو باوجود اس کے کہ ائمہ کرام گوشوں میں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے مگر ان سے بڑی بڑی سلطنتیں لرزا کرتی تھیں۔ اور یہی وہ تجلیاں تھیں جو اقتدار پرست دنیاوی حکمرانوں کو ہوسِ دنیا کی خاطر مجبور کرتی تھیں کہ وہ ایسے عمل کریں جن سے ان کا راستہ صاف ہو جائے۔ ظاہر تو ان کا راستہ ضرور صاف ہو جاتا تھا مگر حقیقتاً ائمہ علیہم السلام نے اپنے مشن کی بنیادیں اتنی مضبوط رکھی تھیں کہ وہ نہ آج تک متزلزل ہوئیں اور نہ قیامت تک متزلزل ہو سکیں گی۔

(سید آفاق حسین رضوی)
آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین والہ الطاہرین

"اسلام" خیالی عقائد کا مجموعہ نہیں تھا۔ وہ اس دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں کے لیے اسی حیات کی کشمکش میں عمل کا صحیح راستا دکھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ راستا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے اس اعتبار سے کہ وہی طریق کار جو ایک حال میں درست ہے ایک دوسری مختلف صورت حال میں وہی نادرست ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ زندگی کے ہر امکانی انقلاب میں صحیح عمل کے نمونے پیش ہو جائیں کیونکہ ان ہی انقلابات میں انسانی کردار کے دوراہے آتے ہیں۔ اور ہر موڑ پر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ راستا صحت کی طرف جا رہا ہے یا غلطی کی طرف۔ یہ مقصد نہ صرف زبانی تعلیم سے پورا ہو سکتا تھا اور نہ کسی ایک ہستی کی سیرت زندگی سے، وہ کتنا ہی بلند کردار کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اس کی بیس ۲۰ یا بائیس ۲۲ سالہ زندگی کتنے ہی مختلف دوروں سے گزری ہو مگر وہ نوع انسانی میں پیش ہونے والے تمام انقلابات پر حاوی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے قدرت نے آل محمد کے سلسلے کے یکے بعد دیگرے بارہ اماموں کو پیدا کیا تھا جن کا مجموعی دور اس عالم میں تین سو ڈھائی سو تیس ۲۳۰ ہے۔

کے سامنے ڈھائی سو برس تک رہا۔ ان ڈھائی سو برس میں تیز و تند ہوائیں بھی چلیں، سخت سے سخت طوفان بھی آئے اور انتہائی شدید زلزلے بھی۔ تمدن، اسباب، ماحول اور حالات نے طرح طرح کی کروٹیں بدلیں، رنگ رنگ کے تغیرات ہوئے۔ ان میں سے ہر منزل میں آل محمدؑ میں سے ایک معصوم ذات نے خلق خدا کے سامنے اپنا اسوۂ حسنہ پیش کیا۔ اور صحیح ر... نگاہ کے سامنے نمایاں کر دیا۔

یاد رہے کہ تاریخ کی مختلف صدیاں اپنے انقلابات میں تقریباً یکساں ہی نمونے پیش کیا کرتی ہیں وہی چند اوراق ہیں جو شکلیں بدل بدل کر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں مگر روحِ حقیقت اُن کی یکساں ہوتی ہے۔

ذرا سی دانائی و بینائی اور ذرا سے گوش و ہوش کی ضرورت ہے۔ پھر حالات اور اُن کے تقاضا کی یکسانی کا اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

آل محمدؑ نے ڈھائی سو برس کے اندر مختلف انقلابات میں اپنے عمل کے جو نقوش چھوڑ دیئے ہیں اُن کے بعد دنیا کا کوئی ماحول، کوئی انقلاب یا کوئی ہنگام ایسا نہیں ہے جس میں انسان اپنے فریضہ کی تعیین میں روشنی محسوس نہ کرے۔ شرط یہ ہے کہ اُن کی سیرت کے نقوش آنکھوں کے سامنے آتے رہیں یہی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کے لیے آل محمد علیہم السلام کے حالات زندگی کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر رسالہ اس سلسلۂ عصمت کی گیارھویں کڑی حضرت امام حسن عسکریؑ کے حالات سے متعلق ہے۔

تائید الٰہی شامل حال رہی تو عنقریب اس سلسلہ کا آخری رسالہ بھی

ناظرین کے سامنے آجائے گا۔

نام ونسب ابو محمدؑ کنیت حسن نام اور سامرے کے محلۂ عسکر میں قیام کی وجہ سے عسکری مشہور لقب ہے۔ والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ اور والدہ سلیل خاتون تھیں۔ جو عبادت، ریاضت، عفت اور سخاوت کے صفات میں اپنے طبقہ کے لیے مثالی حیثیت رکھتی تھیں۔

ولادت ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔

نشو ونما اور تربیت بچپن کے گیارہ سال تقریباً اپنے والد بزرگوار کے ساتھ وطن میں رہے جس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ بے زمانہ اطمینان سے گزرا۔ اس کے بعد امام علی نقیؑ کو سفر عراق درپیش ہو گیا اور تمام متعلقین کے ساتھ ساتھ امام حسن عسکریؑ اتنی کم سنی کے عالم میں سفر کی زحمتوں کو اٹھا کر سامرے پہنچے۔ یہاں کبھی قید، کبھی نظر بندی اور کبھی کسی حد تک آزادی مختلف دور سے گزرنا پڑا۔ مگر ہر حال میں آپ اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے ساتھ ہی ساتھ رہے۔ اس طرح باطنی اور ظاہری طریقہ پر حیثیت سے آپ کو اپنے والد بزرگوار کی تربیت و تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکا جبکہ اس کے ساتھ وہ تعلیم ربانی جو حقیقت میں ان بلند مرتبہ ہستیوں کے لیے بلند نظر کی پوشیدہ طاقتوں کے توسط سے ان کے کمال ذات وصفات کی ضامن ہے۔ ان کے لیے اسی طرح موجود تھی جس طرح ان کے والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ اور اس سے پہلے ان کے والد حضرت امام محمد تقیؑ کے لیے اس کا غیر معمولی نتیجہ تھا جو ظاہری طور پر آغوش تعلیم و تربیت سے بچپن ہی میں جدا ہو جانے

سکے) دوست و دشمن کی نگاہوں کے سامنے آچکا تھا۔

زمانۂ امامت آپ سنہ ۲۵۴ھ میں آپ کی عمر ابھی ۲۲ برس کی تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ کی وفات ہوئی۔ حضرت نے اپنی وفات سے چار مہینہ قبل آپ کے متعلق اپنے وصی و جانشین ہونے کا اظہار فرما کر اپنے اصحاب کی گواہیاں لے لی تھیں۔ اب امامت کی ذمہ داریاں امام حسن عسکریؑ کے متعلق ہوئیں تھیں آپ باوجود انتہائی شدید مشکلات اور سخت ترین ماحول کے ادا فرماتے رہے۔

سلاطین وقت اور ان کا رویہ جیسا کہ اس کے پہلے ضمناً بیان ہوا امام حسن عسکریؑ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ ان تمام تکالیف اور مصائب میں بھی شریک رہے جو آپ کے والد بزرگوار کو حراست اور نظربندی کے ذیل میں متعدد بار برداشت کرنا پڑے۔

اس کے بعد جب آپ کا دور امامت شروع ہوا ہے تو سلطنت بنی عباس کے تخت پر معتز باللہ عباسی کا قیام تھا۔ معتز کی معزولی کے بعد مہتدی کی سلطنت ہوئی۔ گیارہ مہینے چند روز حکومت کرنے کے بعد اس کا خاتمہ ہوا اور معتمد کی حکومت قائم ہوئی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی بادشاہ ایسا نہ تھا جس کے زمانہ میں امام حسن عسکریؑ کو آرام و سکون ملتا باوجودیکہ اس وقت سلطنت بنی عباس بڑی سخت الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار تھی۔ مگر ان تمام سیاسی مسائل اور مشکلات کے ساتھ ہر حکومت نے امام حسن عسکریؑ کو قید و بند میں رکھنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا اس کا خاص سبب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کی یہ حدیث تھی کہ میرے بعد بارہ جانشین ہوں گے اور اُن میں سے
آخری مہدی آخر الزمان اور قائم آل محمد ہوگا۔ یہ حدیث برابر متواتر طریقہ
سے عالم اسلام میں گردش کرتی رہی تھی۔

خلفائے بنی عباس خوب جانتے تھے کہ سلسلہ آل محمد کے وہ افراد جو
رسولؐ کی صحیح جانشینی کے مصداق ہوسکتے ہیں وہ یہی افراد ہیں جن میں سے
گیارھویں ہستی امام حسن عسکریؑ کی ہے اس لیے ان ہی کا فرزند وہ ہو سکتا ہے جس
کے بارے میں رسول کی پیشین گوئی صحیح قرار پاسکے۔ لہذا کوشش یہ تھی کہ ان
کی زندگی کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے اس طرح کہ ان کا کوئی جانشین دنیا میں
موجود نہ ہو سبب تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے لیے اُس نظر بندی پر اکتفا
نہیں کی گئی جو امام علی نقیؑ کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی بلکہ آپ کے لیے اپنے
گھر بار سے الگ قید تنہائی کو ضروری سمجھا گیا یہ اور بات ہے کہ قدرتی
انتظام کے ماتحت درمیان میں انقلابات سلطنت کے وقفے آپ کی قید مسلسل
کے بیچ میں تھوڑی رہائی کے سامان پیدا کر دیا کرتے تھے مگر پھر بھی جو بادشاہ
تخت سلطنت پر بیٹھتا تھا وہ اپنے پیش رو کے نظریہ کے مطابق آپ کو دوبارہ
مقید کرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اس طرح آپ کی مختصر زندگی جو دورِ امامت کے
بعد تھی اُس کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گزرا۔

اس قید کی سختی معتمد کے زمانے میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ وہ مثل دیگر
ظالم سلاطین کے آپ کے مرتبہ اور حقانیت سے خوب واقف تھا چنانچہ
جب قحط کے موقع پر ایک عیسائی راہب کے دعوے کے ساتھ پانی برسانے

کی وجہ سے مسلمانوں میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور لوگ عیسائیت کی طرف دوڑنے لگے تو مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وہ امام حسن عسکریؑ ہی تھے جو قید خانہ سے باہر لائے گئے آپ نے مسلمانوں کے شکوک کو دور کر کے انھیں اسلام کے جادہ پر قائم رکھا اس واقعہ کا اتنا اثر بھی ہوا کہ اب معتمد کو آپ کو پھر اسی قید خانہ میں واپس کرنے میں انتشار کا اندیشہ دامن گیر ہوا اس لیے آپ کی قید کو آپ کے گھر میں نظر بندی کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا مگر آزادی پھر بھی نصیب نہ ہو سکی۔

سفراء کا تقرر

ائمہ اہلبیت جس حال میں بھی ہوں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے امامت کے فرائض کو انجام دیتے رہتے تھے۔ امام حسن عسکریؑ پر اتنی شدید پابندیاں تھیں کہ انھیں علوم اہلبیت کے طالبان اور شریعت جعفری کے مسائل دریافت کرنے والوں کا آپ تک پہنچنا کسی صورت سے ممکن نہ تھا۔ اس لیے حضرت نے اپنے زمانہ میں یہ انتظام کیا کہ ایسے افراد جو امانت و دیانت نیز علمی و فقہی بصیرت کے اس درجہ حامل تھے کہ امام کے کامل اعتماد ہو سکیں انھیں اپنی جانب سے آپ نے نائب مقرر کر دیا تھا۔ جہاں تک کہ خود اپنی ذاتی تعلیمات کے حدود میں دیکھتے تھے اس حد تک مسائل خود ہی بتا دیتے تھے اور وہ اہم مسائل جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے تھے انھیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر امام کی خدمت میں رسائی حاصل کر کے ان کو حل کرا لیتے تھے کیونکہ ایک شخص کا کبھی کبھی امام سے ملاقات کو آ جانا حکومت کے لیے اتنا ناقابل برداشت نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ تمام کی

جماعتوں کا مختلف اوقات میں حضرت تک پہنچا۔

ان ہی سفراء کے ذریعہ سے ایک اور اہم خدمت بھی انجام پاتی تھی وہ یہ کہ جس وقت حکومت الٰہیہ کا پابند ہونے کی حیثیت سے اس نظام حکومت کو تسلیم کرنے والے جتنے اپنے گروہوں کی خدمت میں پہنچانے سے ہوا اور ان بزرگوں کی نگرانی میں وہ ہمیشہ دینی امور کے انصرام اور سادات کی تنظیم و سرپرستی میں صرف ہوتا رہا۔ اب وہ رازدارانہ طریقہ پر ان ہی ناتبوں کے پاس آتا تھا اور یہ امام علیہ السلام سے ہدایات حاصل کر کے انہیں ضروری مصارف میں صرف کرتے تھے۔ یہ افراد اس حیثیت سے بڑے سخت امتحان کی منزل میں تھے کہ ان کو ہر وقت سلطنت وقت کے جاسوسوں کی سراغ رسانی کا اندیشہ رہتا تھا۔ اسی لیے عثمان بن سعید اور ان کے بیٹے ابوجعفر محمد بن عثمان نے جو امام حسن عسکری کے ممتاز نائب تھے اور عین دار السلطنت بغداد میں مقیم تھے اپنے پاس مسلسل آنے والی آمدنی کو چھپانے کے لیے ایک بڑی دوکان روغنیات کی کھول لی تھی۔ اس طرح حکومت جور کے متشددانہ طرز عمل کے اندر بھی حکومت الٰہیہ کا آئینی نظام چل رہا تھا۔ اور حکومت کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

اخلاق و اوصاف | ذات اسی سلسلہ عصمت کی ایک کڑی تھی جس کا ہر حلقہ انسانی کمالات کے جواہر سے مرصع تھا۔

علم و حلم، عفو و کرم، سخاوت و ایثار سب ہی اوصاف بے مثال تھے عبادت کا یہ عالم تھا کہ جس زمانہ میں بھی کہ جب آپ سخت قید میں تھے

نے جس سے آپ کے متعلق دریافت کیا یہی معلوم ہوا کہ آپ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور سوائے ذکر الٰہی کے کسی سے کوئی کلام نہیں فرماتے۔ اگرچہ آپ کو اپنے گھر پہ آزادی کی سانسیں لینے کا موقع بہت ہی کم ملا پھر بھی جتنے عرصہ تک قیام رہا دور دور دراز سے لوگ آپ کے فیض و عطا کے تذکرے سن کر آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔ آپ کے اخلاق و اوصاف کی عظمت کا عوام و خواص سب ہی کے دلوں پہ سکّہ قائم تھا۔ چنانچہ جب احمد بن عبداللہ بن خاقان کے سامنے جو خلیفۂ عباسی کی طرف سے شہر قم کے اوقاف و صدقات کے شعبہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ سادات علوی کا تذکرہ آ گیا تو وہ کہنے لگا کہ مجھے کوئی سید حسن عسکری سے زیادہ بلند مرتبہ اور علم و ورع، زہد و عبادت، وقار و ہیبت، حیا و عفت، شرف و عزت اور قدر و منزلت میں ممتاز اور نمایاں نہیں معلوم ہوا۔ اُس وقت جب امام علی نقیؑ کا انتقال ہوا۔ اور لوگ تجہیز و تکفین میں مشغول تھے تو بعض گھر کے ملازمین نے اثاث البیت وغیرہ میں سے کچھ چیزیں غائب کر دیں اور انھیں خبر نہ تھی کہ امام کو اس کی اطلاع ہو جائے گی۔ جب تجہیز و تکفین وغیرہ سے فراغت ہوئی تو آپ نے اُن نوکروں کو بلایا اور فرمایا کہ جو کچھ پوچھتا ہوں اگر تم مجھ سے سچ سچ بیان کر دو گے تو میں تمھیں معاف کر دوں گا اور سزا نہ دوں گا لیکن اگر غلط بیانی سے کام لیا تو پھر میں تمہارے پاس سے سب چیزیں برآمد بھی کرا لوں گا اور سزا بھی دوں گا اس کے بعد آپ نے ہر ایک سے اُن اشیاء کے متعلق جو اُس کے پاس تھیں دریافت کیا اور جب انھوں نے سچ سچ بیان کر دیا تو ان تمام چیزوں کو اُن سے واپس لے کر آپ نے اُن کو

کسی قسم کی سزا نہ دی اور معاف کر دیا۔

علمی مرکزیت

باوجود یکہ آپ کی عمر بہت مختصر ہوئی یعنی صرف اٹھائیس برس مگر اس محدود اور مشکلات سے بھری ہوئی زندگی میں بھی آپ کے علمی فیوض سے دریائے بڑے بڑے بندگانِ علما کے سیراب ہونے کا موقع دیا۔ نیز اس زمانہ کے فلاسفہ جو دہریت اور الحاد کی تبلیغ کر رہے تھے اُن کا مقابلہ فرمایا جن میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ان میں ایک اسحٰق کندی کا واقعہ ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کے آیات سے باہمی تناقض سے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا یہ خبر امام حسن عسکریؑ کو پہونچی اور آپ موقع کے منتظر ہو گئے اتفاق سے ایک روز ابو اسحٰق کے کچھ شاگرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اتنا سمجھدار آدمی نہیں ہے۔ جو اپنے استاد کندی کو اس فضول مشغلے سے روکے جو انھوں نے قرآن کے بارے میں شروع کر رکھا ہے ان طلاب نے کہا حضور ہم تو اُن کے شاگرد ہیں ہم بھلا اُن پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا اتنا تو تم کر سکتے ہو کہ جو کچھ باتیں میں تمھیں بتاؤں وہ تم اُن کے سامنے پیش کر دو۔ طلاب نے کہا جی ہاں اتنا ہم کر سکتے ہیں۔

حضرت نے کچھ آیتیں قرآن کی جن کے متعلق باہمی اختلاف کا توہم ہو رہا تھا پیش فرما کر اُن سے کہا کہ تم اپنے اُستاد سے اتنا پوچھو کہ کیا ان الفاظ کے بس یہی معنی ہیں جن کے لحاظ سے وہ تناقض ثابت کر رہے ہیں اور اگر کلامِ عرب کے شواہد سے دوسرے متعارف معنی نکل آئیں جن کے بنا پر الفاظ قرآن میں باہم کوئی اختلاف نہ رہے تو پھر اُنھیں کیا حق ہے کہ وہ اپنے ذہنی خود ساختہ معنی کو متکلمِ قرآنی کی طرف

منسوب کرکے تناقض و اختلاف کی عمارت کھڑی کریں۔ اس ذیل میں آپ نے
کچھ شواہد کلامِ عرب کے بھی اُن طلاب کے ذہن نشین کرائے۔ ذہین طلاب نے وہ پوری
بحث اور شواہد کے حوالے محفوظ کر لیے اور اپنے اُستاد کے پاس جا کر اِدھر اُدھر کی
باتوں کے بعد یہ سوالات پیش کر دیے۔ آدمی بہرحال وہ منصف مزاج تھا اُس نے
طلاب کی زبانی وہ سب کچھ سُنا اور کہا کہ یہ باتیں تمہاری قابلیت سے بالاتر ہیں۔
تم سچ بتانا کہ یہ سب نکتے معلوم کہاں سے ہوا؟ پہلے تو اُن طالب علموں نے چھپانا
چاہا اور کہا کہ یہ چیزیں خود ہمارے ذہن میں آئی ہیں مگر جب اُس نے سختی کے
ساتھ انکار کیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تو اُنھوں نے بتا دیا کہ ہمیں امام حسن عسکری
نے یہ باتیں بتائی ہیں۔ یہ سن کر اُس نے کہا کہ سوائے اُس گھرانے کے اور کہیں سے یہ جملہ باتیں حاصل
ہی نہیں ہو سکتی تھیں پھر اُس نے آگ منگوائی اور جو کچھ لکھا تھا وہ نذرِ آتش کر دیا۔ ایسے
کتنے ہی علمی اور دینی خدمات تھے جو خاموشی کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر انجام پا رہے تھے اور
حقائق و مشاہدات جو حکومت اسلام کی دعویدار تھی اپنے عیش و طرب کے نشے میں مدہوش تھی
یا پھر جو کبھی ہوش میں آتی تو ایسے مخلص حامیِ اسلام کی طرف سے اپنی سلطنت کے لیے خطرہ محسوس
کرکے ان پر کچھ پابندیاں بڑھا دیے جانے کے احکام نافذ کر دیتی تھی مگر اس گروہ کے ان کے
صبر و استقلال میں فرق نہ آتا تھا۔

جوامع حدیث میں بھی محدثین اسلام نے آپ کی سند سے احادیث نقل کیے ہیں ان
میں سے ایک خاص حدیث شراب خواری کے متعلق ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "شارب
الخمر کعابد الوثن" "شراب پینے والا مثل بت پرست کے ہے"
اس کو ابن الجوزی نے اپنی کتاب "تحریم الخمر" میں سند متصل کے ساتھ درج کیا ہے۔

اور ابونعیم فضل بن دکین نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ثابت ہے جس کی اہلبیت طاہرین نے روایت کی ہے اور صحابہ میں سے ایک گروہ نے بھی اس کی رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ جیسے ابن عباس، ابوہریرہ، انس، عبداللہ بن ابی اوفی اسلمی اور دوسرے حضرات

سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ "ابومحمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم طوسی بلاذری حافظ واعظ نے مکہ معظمہ میں امام اہلبیت ابومحمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی الرضا سے احادیث سن کر قلمبند کیے"

ان کے علاوہ حضرت کے تلامذہ میں سے چند باوقار ہستیوں کے نام درج ذیل ہیں۔ جن میں سے بعض نے حضرت کے علمی افادات کو جمع کر کے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔

(۱) ابوہاشم داؤد بن قاسم جعفری سن رسیدہ عالم تھے انھوں نے امام رضاؑ سے امام حسن عسکریؑ تک چار اماموں کی زیارت کی اور ان بزرگواروں سے فیوض بھی حاصل کیے۔ وہ امام علیہ السلام کی طرف سے نیابت کے درجہ پر فائز تھے۔ (۲) داؤد بن ابی زید نیشاپوری امام علی نقیؑ کے بعد امام حسن عسکریؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے۔ (۳) ابوطاہر محمد بن علی بن بلال (۴) ابوالعباس عبداللہ بن جعفر حمیری قمی بڑے بلند پایہ عالم بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے قرب الاسناد کتاب اس وقت تک موجود ہے اور کافی وغیرہ کے ماخذوں میں سے ہے (۵) محمد بن احمد بن جعفر قمی حضرت کے خاص نائبین میں سے تھے (۶) جعفر بن سہیل صیقل یہ بھی نائب خاص ہونے کا شرف رکھتے تھے (۷) محمد بن حسن صفار قمی بڑے مرتبہ کے عالم متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بصائر الدرجات مشہور کتاب ہے انھوں نے امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں تحریری مسائل بھیج کر ان کے جوابات حاصل کیے۔ (۸) ابوجعفر ہمانی برمکی۔ امام حسن عسکریؑ سے مسائل فقہیہ کے جوابات حاصل کر کے

کتاب مرتب کی۔ (۹) ابراہیم بن ابی حفص ابو اسحٰق کاتب حضرت کے اصحاب میں سے
ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ (۱۰) ابراہیم بن مہزیار مصنف کتاب البشارات۔ (۱۱) احمد
بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن داؤد بن حمدان الکاتب الندیم علم لغت و ادب کے مسلم استاد
تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ حضرت امام حسن عسکریؑ سے خاص خصوصیت رکھتے تھے۔
(۱۲) احمد بن اسحٰق الاشعری ابو علی القمی بڑے پایہ کے مستند و مسلم عالم تھے۔ ان کی تصانیف
میں سے علل الصوم اور دیگر متعدد کتابیں تھیں۔

یہ چند نام بطور مثال درج کیے گئے۔ اگر تمام ان افراد کا تذکرہ کیا جائے تو اس
کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تفسیر قرآن میں ابو علی حسن بن
خالد بن محمد بن علی برقی نے آپ کے ارشادات سے ایک ضخیم کتاب لکھی جو حقیقت میں
خود حضرت ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے یعنی حضرت بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتے
جاتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک سو بیس ۱۲۰ اجزاء پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ علمی ذخیرہ اس وقت ہاتھوں میں موجود نہیں ہے۔ مختلف کتابوں
میں تفسیر قرآن کے متعلق حضرت کے بعض ارشادات ملتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی سے ماخوذ ہوں
۔ بے شک ایک کتاب "تفسیر امام حسن عسکریؑ" کے نام سے شائع شدہ موجود ہے مگر وہ
مذکورہ بالا ذخیرۂ علمی سے یقیناً مختلف ہے۔ موجودہ تفسیر کا پتہ صرف چوتھی صدی ہجری سے
چلتا ہے اور شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی رحمۃ اللہ نے اس کو معتبر سمجھا ہے مگر ان کے
پیش رو افراد جن سے موصوف نے اس تفسیر کو نقل کیا ہے بالکل مجہول الحال ہیں۔ چنانچہ
اس تفسیر کے متعلق علمائے رجال مطمئن نہیں ہیں۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی نسبت
امام حسن عسکریؑ کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بے شک آپ کا ایک طویل مکتوب

اسحٰق بن اسمٰعیل اشعری کے نام اور کافی ذخیرہ مختصر حکیمانہ مقولات اور مواعظ و تعلیمات کا کتاب تحف العقول میں محفوظ ہے جو اس وقت بھی اہل نظر کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔

یہ علمی کارنامے اس حالت میں ہیں جبکہ مجموعی عمر آپ کی ۲۸ برس سے زیادہ نہ ہو سکی اور والد بزرگوار کے بعد صرف چھ برس امامت کے منصب پر فائز رہے اور وہ بھی اُن مشکلات کے شکنجہ میں جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

وفات اتنے علمی و دینی مشاغل میں مصروف انسان کو کہیں سلطنت وقت کے ساتھ مزاحمت کا کوئی خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر ان کا بڑھتا ہوا روحانی اقتدار اور علمی مرجعیت ہی تو ہمیشہ ان حضرات کو سلاطین کے لیے ناقابل برداشت ثابت کرتی رہی۔ وہی اب بھی ہوا اور معتمد عباسی کے بھجوائے ہوئے زہر سے ۸ ربیع الاول سنہ ۲۶۰ھ میں آپ نے وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس سامرے میں دفن ہوئے۔ جہاں حضرت کا روضہ باوجود ناموافق ماحول کے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

تمام شد

۱۶

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی
آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۰۹
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
یوسفی پریس لکھنؤ

مصنفہ

سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ
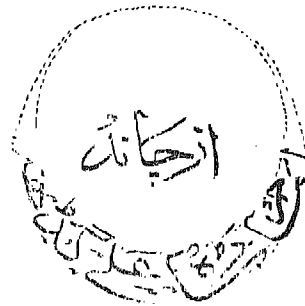
تعارف

بارھویں امام کے حالات زندگی سے متعلق یہ رسالہ ایسے وقت شائع ہو رہا ہے جب کہ ہزاروں اللہ کے بندے اپنی زندگیوں سے بیزار آپ کے ظہور کا بےچینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ امام منتظر کے ظاہر ہونے کے وقت دنیا کے حالات کے متعلق جیسی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، موجودہ زمانہ ویسا تو نہیں ہے مگر اسی طرح کا ماحول ایک حد تک بنتا چلا آ رہا ہے۔ یہی سلسلہ جاری رہے تو وہ دن دور نہیں ہے۔ تمنا تو یہی ہے کہ وہ زمانہ کاش ہماری زندگی ہی میں آ جاتا...

ان چند اوراق میں امام عصر کے حالات عقلی حیثیت سے لکھنے کی گنجائش کہاں۔ یہ تو قلم کی آزادی اور کاغذ کی فراوانی چاہتا ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں امام زمانہ کے حالات صرف ثابت شدہ واقعات اور روایات کی رو سے لکھے گئے ہیں۔ اگر بارھویں امام کے وجود کو عقلی حیثیت سے سمجھنا مقصود ہو تو "وجود حجت" ملاحظہ فرمایئے۔ یہ کتاب بھی اسی رسالے کے گرامی مرتبت مصنف جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس وقت دنیائے تشیع میں صرف آپ ہی کی ذات مقدس وہ منارۂ علم ہے جو حد درجہ پیچیدہ، انتہائی الجھے ہوئے اور لاینحل موضوعات پر انتہائی مدلل اور سلیس طریقے پر لکھ سکتی ہے۔

الحمد للہ کہ بارہ اماموں کی مختصر سوانح عمریوں کا سلسلہ پورا ہو گیا۔ اب پیغمبر اسلام اور جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی سوانح عمریاں باقی رہ گئی ہیں جو انشاء اللہ زمانہ قریب ہی میں شائع ہو جائیں گی۔

ان مختصر سوانح عمریوں سے جہاں اور بہت سے سبق ملتے ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ مخالف سے مخالف زمانے اور تاریک سے تاریک ماحول میں عقل و شعور کے سہارے کس طرح باعزت زندگی گزاری جا سکتی ہے، کس طرح آندھیوں، سیلابوں اور زلزلوں میں ٹھہرا جا سکتا ہے اور کس طرح وقت آنے پر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا جا سکتا ہے اور کس طرح خدا پر تکیہ کرنے والے صابر و شاکر انسانوں کے دلوں سے خوف و ڈر، اور باہر کی طاقتوں اور شخصیتوں کا احساس کافور ہو جاتا ہے۔

خادم مشن   سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری   ۲۴ اکتوبر [illegible]

"امام منتظر عجل اللہ فرجہ ہیں جو اپنے جد بزرگوار حضرت پیغمبر خدا کے بالکل ہم نام اور صورت و شکل میں ہو بہو ان کی تصویر ہیں۔ والدۂ گرامی آپ کی "نرجس" خاتون قیصر بادشاہ روم کی پوتی اور شمعون وصی حضرت عیسیٰؑ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکریؑ کی ہدایت سے حضرت کی بزرگ مرتبہ ہمشیرہ حلیمہ خاتون نے ان کو مسائل دینیہ و احکام شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

القاب و خطابات

غالباً ائمہ معصومینؑ میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے "امام عصر" کے ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور ذیل کے خطابات ہیں۔

(۱) المہدی: یہ ایسا خطاب ہے جو نام کا قائم مقام بن گیا ہے اور پیشینگوئیاں جو آپ کے وجود کے متعلق پیغمبر اکرمؐ اور دیگر ائمہ معصومینؑ کی زبان پر آئی ہیں وہ زیادہ تر اس لفظ کے ساتھ ہیں اور اسی لیے آنے والے "مہدیؑ" کا اقرار تقریباً ضروریات اسلام میں داخل ہو گیا ہے جس میں اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو اوصاف و حالات کی تعیین میں لیکن اصل "مہدیؑ" کے ظہور کا عقیدہ مسلمانوں کے ہر شخص کو رکھنا لازمی ہے۔ ان حضرات کا ذکر نہیں جو اپنے کو مسلمان صرف سوسائٹی کے اثر یا سیاسی مصلحتوں سے کہتے ہیں مگر ان کے دل میں حاضر و ناظر معدلت پسند رب الارباب کا عقیدہ ہی موجود نہیں تو اس کے رسول کی کسی ایسی خبر غیبی کی تصدیق کا جو ابھی وقوع میں نہیں آئی ان کے حاشیہ خیال میں کہاں جگہ پا سکتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو معمول کے خلاف اس رسالہ میں مخاطب بنانا نہیں چاہا ہے۔

"مہدی" کے لفظ کے معنی "ہدایت پائے ہوئے" کے ہیں اسی لحاظ سے کہ اصل "ہادی"

راہنمائی فرمانے والی ذات خالق ہے جس کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے قرآن کریم میں
یہ آیت آئی ہے (انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء) تمہارے
بس کی بات نہیں ہے کہ جسے چاہو تم ہدایت کر دو بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے"
اور اسی بنا پر سورۂ الحمد میں بارگاہ الٰہی میں دعا کی گئی ہے "اھدنا الصراط المستقیم" مگر
سیدھے راستے پر لگانے والے اس فقرہ کو خود پیغمبر اور ائمہ معصومینؑ بھی اپنی زبان پر جاری کرتے
تھے اس لئے خالق عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان رہنمایان دین کو "مہدی" کہنا صحیح تھا۔
جو صفت کے لحاظ سے سب ہی بزرگوار تھے اور خطاب کے لحاظ سے حضرت "امام منتظر"
کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

(۲) "القائم" لقب ان احادیث سے ماخوذ ہے جس میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ
و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص
قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔

(۳) "صاحب الزمان" اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ آپ ہی اب یہ زمانہ کے رہنمائے حقیقی ہیں۔

(۴) "حجت" خدا ہر نبی اور امام اپنے دور میں خلق کی حجت ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ہدایت
کی ذمہ داری جو اللہ پر ہے وہ پوری ہوتی ہے اور بندوں کے پاس کچھ کہنے کے جواز
کی کوئی سند نہیں رہتی چونکہ دور اس زمانہ میں رہنمائی خلق کی ذمہ داری حضرت کے ذریعے سے
پوری ہوتی ہے اسلئے تا قیام قیامت حجت خدا آپ ہیں۔

(۵) "منتظر" چونکہ امام مہدی کے ظہور کی پیشینگوئی برابر رہنمایان دین دیتے رہے
یہاں تک کہ صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی ایک امام کی آمد کی

مگر ایک آنے والے کا آخر زمانہ میں انتظار ہے۔ ولادت کے قبل سے پیدائش کا انتظار رہا اور
اب غیبت کے بعد دنیا کو ظہور کا انتظار ہے اسلئے آپ خود حضرت حکم الٰہی کے منتظر
ہوتے ہوئے تمام خلق کے لئے منتظر یعنی جس کا انتظار ہیں۔

پیشین گوئیاں

آپ کے دنیا میں آنے سے پہلے پیشین گوئی مسلسل طریقہ پر پیغمبر اسلامؐ
اور ائمہ معصومینؑ کی زبانوں پر آتی رہی تھیں جن کا [illegible] اس وقت
ہر معصوم کی صرف ایک خبر بطور نمونہ درج کی جاتی ہے۔

حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰؐ

حضرت کی زبان مبارک سے احادیث اس کثرت
اس موضوع پر وارد ہوئے ہیں کہ صحاح و مسانید و اخبار کے کتب ان سے مملو ہیں
ابتدیہ و علمائے اہلسنت نے ان کو مستقل تصانیف میں جمع کیا ہے جیسے حافظ محمد
بن یوسف گنجی شافعی نے "البیان فی اخبار صاحب الزمان" میں حافظ ابو نعیم اصفہانی نے
"ذکر نعت المہدی" ابو داؤد سجستانی نے اپنے سنن میں جو کہ صحاح ستہ میں شمار ہوتا ہے
"کتاب المہدی" کا مستقل عنوان قائم کیا ہے یہی طریقہ ترمذی نے صحیح میں اور ابن
ماجہ قزوینی نے اپنی کتاب سنن میں رکھا [illegible] احادیث کو وارد کیا
صرف ایک حدیث بیان درج کی جاتی ہے جسے ابراہیم حموینی شافعی نے
اپنی کتاب "فرائد السمطین" میں درج کیا ہے۔ وہ یہ ہے ابن عباس نے روایت کی
حضرت رسول خداؐ نے فرمایا۔ انا سید النبیین و علی سید الوصیین وان
اوصیائی بعدی اثنا عشر اولھم علی و آخرھم المہدی۔ میں انبیاء کا
سردار ہوں اور علی اوصیاء کے سردار ہیں میرے اوصیاء و قائم مقام میرے بعد بارہ ہونگے

جنمیں اوّل علی ہیں اور آخری "مہدی" ہونگے۔

(۲) حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا | کافی کلینی میں جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت ہے

کہ حضرت فاطمہ زہرا کے پاس ایک لوح تھی جس میں تمام اوصیاء و ائمہ کے نام درج تھے جناب جابر نے اس لوح سے تمام بارہ اماموں کے ناموں کی تصدیق کی جو ان میں سے تین محمد تھے اور چار علی ان کی آخری نسل آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو قائم ہو گی۔

(۳) حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب | جناب شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی نے کمال الدین

میں امام رضا کی حدیث آپکے آبائے طاہرین کے ذریعے نقل کی ہے کہ جناب امیر نے اپنے فرزند امام حسین کو مخاطب کر کے فرمایا تیری نسل میں سے نواں وہ ہے جو حق کے ساتھ قائم دین کا ظاہر کرنے والا اور عدل و انصاف کا پھیلانے والا ہوگا۔

(۴) امام حسن مجتبیٰ | صدوق کمال الدین میں ہے بھائی حسین کی نسل سے نواں جب پیدا ہوگا تو خداوند عالم اسکی عمر کو غیبت کی حالت میں طولانی کریگا پھر جب قدرت آئیگا تو اسے اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر فرمائیگا۔

سید الشہداء امام حسین | نواں میری نسل میں سے وہ امام ہے جو حق کے ساتھ قائم ہوگا جسکے ذریعہ سے اللہ زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کریگا اور جسکے ذریعہ سے دین حق کو تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہوگا اسکی ایک طولانی غیبت ہو گی جس میں بہت سے گمراہ ہو جائینگے اور کچھ ثابت قدم رہینگے جنہوں اذیتیں برداشت کرنا پڑینگی

اور اُن سے لوگ کہینگے کہ اگر سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ پورا کب ہوگا جو اس غیبت کے زمانہ مین اس اذیت اور انکار پر صبر کرینگے انھین رسول کے ہمراہ رکاب جہاد کرنے کا ثواب حاصل ہوگا۔

(۶) امام زین العابدین ؑ ”ہم مین سے قائم وہ ہوگا جسکی ولادت لوگون سے پوشیدہ رہیگی یہان تک کہ عام لوگ کہینگے وہ پیدا ہی نہین ہوا“۔

(۷) امام محمد باقر ؑ کافی کلینی ”حسین ؑ کے بعد نو امام معین ہین جن مین سے نوان قائم ہوگا۔

(۸) امام جعفر صادق ؑ علل الشرائع شیخ صدوق مین روایت ہے فرمایا حضرت نے کہ میرے موسیٰ فرزند کی نسل سے پانچوان قائم آل محمد ہوگا“

(۹) امام موسیٰ کاظم ؑ کمال الدین صدوق مین کسی نے امام موسیٰ کاظم ؑ سے کہا کہ کیا آپ قائم بحق ہین حضرت نے فرمایا ”حق کے ساتھ قائم و برقرار تو مین بھی ہون مگر اصل مین قائم وہ ہوگا جو زمین کو دشمنان خدا سے پاک کریگا اور اُسے عدل و انصاف سے مملو کردیگا۔ وہ میری اولاد مین سے پانچوان شخص ہوگا جسکی ایک طولانی غیبت ہوگی جس مین بہت سے مرتد ہوجائینگے اور کچھ لوگ ثابت قدم رہینگے“۔

(۱۰) امام رضا ؑ دعبل نے آپ کے سامنے جب اپنا مشہور قصیدہ پڑھا اور اس مین ان دو شعرون تک پہونچے۔

خروج امام لا محالة قائم	یقوم علی اسم اللہ والبرکات
یمیز فینا کل حق وباطل	ویجزی علی النعماء والنقمات
زمانہ مین ظہور قائم آل عبا ہو گا	مدد سے جو خدا کے نام و برکت کی کھڑا ہو گا
جہان مین امتیاز حق و باطل آکے کر دیگا	وہ دیگا مومنون کافر کو ہر کردار کا بدلا

یہ سنتے ہی امام رضاؑ نے گریہ فرمایا اور پھر سر اٹھا کر کہا اے دعبل یہ شعر تمہاری زبان پر روح القدس نے جاری کرائے ہیں تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ امام کون ہے اور کب کھڑا ہوگا دعبل نے کہا یہ تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں مگر میں یہ سنتا رہا ہوں کہ آپ میں ایک امام ایسا ہوگا جو زمین کو فساد سے پاک کرکے عدل سے بھر دیگا حضرت نے فرمایا اے دعبل میرے بعد امام میرا فرزند محمدؑ ہوگا اور اسکے بعد اسکا فرزند علیؑ اور علیؑ کے بعد اسکا بیٹا حسنؑ اور حسنؑ کے بعد اسکا بیٹا "قائم" ہوگا جسکی غیبت کے دور میں اسکا انتظار رہیگا اور ظہور کے موقع پر دنیا اسکے سامنے سر تسلیم خم کرے گی۔"

(۱۱) امام محمد تقیؑ | قائم ہم میں سے وہی مہدیؑ ہوگا جو میری نسل میں تیسرا ہوگا۔

(۱۲) امام علی نقیؑ | میرا جانشین تو میرے بعد میرا فرزند حسنؑ ہے مگر اسکے جانشین کے دور میں تمہارا کیا عالم ہوگا سننے والے نے پوچھا کہ کیوں؟ اسکا کیا مطلب ہے؟ فرمایا اسلئے کہ تمہیں اسے دیکھنے کا موقع نہ ملیگا اور اسکے نام تک لینے کی اجازت نہ ہوگی عرض کیا گیا پھر انکا نام کس طرح لیا جائیگا فرمایا بس یوں کہنا کہ "الحجۃ من آل محمدؑ"۔

(۱۳) امام حسن عسکریؑ | حضرت سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپکے آبائے طاہرینؑ نے فرمایا ہے کہ زمین حجت خدا سے قیامت تک کبھی خالی نہیں ہوسکتی؟ اور یہ جو مر جائے اور اپنے امام زمانہ کی اسے معرفت حاصل نہ ہوئی ہو وہ جاہلیت کی موت دنیا سے گیا؟ آپ نے فرمایا کہ بیشک یہ اسی طرح حق ہے جس طرح روز روشن حق ہوتا ہے "عرض کیا گیا کہ پھر حضور کے بعد حجت" امام" کون ہوگا فرمایا میرا فرزند جو پیغمبرؐ کا ہمنام ہے میرے بعد امام و حجت ہوگا جو شخص بغیر اسکی معرفت حاصل کیے ہوئے دنیا سے اٹھا وہ جاہلیت کی موت مرا بیشک اسکی غیبت کا دور اتنا طولانی ہوگا جس میں جاہل لوگ حیران و سرگرداں پھرینگے اور باطل پرست ہلاکت و تباہی میں گرفتار ہونگے اور وقت مقرر

کرکے پیشینگوئی بیان کرنے والے غلط گو ہونگے۔

نتیجہ: ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام صلعم کے وقت سے لیکر برابر ہر دور میں اُس ذات کی جستجو کی جاتی رہی تھی جو مہدی موعود ہوگا بلکہ دعبل کی روایت سے ظاہر ہے کہ یہ امر اتنا مشہور تھا کہ شعراء تک اسے نظم کرتے تھے اسکے ساتھ تاریخ پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوست و دشمن سب ان حدیثوں سے واقف تھے یہاں تک کہ بسا اوقات اُن سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ سلسلۂ عباسیہ میں سے محمد نام جسکا تھا اُس نے اپنا لقب مہدی اسی لیے اختیار کیا اور نسل امام حسنؑ سے عبداللہ محض کے فرزند محمد کے متعلق بھی مہدی ہونیکا عقیدہ قائم کیا گیا اور کیسانیہ نے محمد بن حنفیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا مگر اہلبیتؑ میں سے ایک معصوم ہستی کا اُسی وقت موجود ہونا خود ان خیالات کی (تردید) کے لیے کافی تھا اور یہ حضرات ان غلط دعویداروں کے دعاوی کے غلط بتانے کے ساتھ اصل "مہدی" کے اوصاف اور اسکی غیبت کا تذکرہ برابر کرتے رہے اس سے حقیقت صاف ظاہر ہوگئی کہ اصلی "مہدی" کی تشریف آوری کا انتظار متفقہ طور پر موجود تھا اسکے ساتھ پیغمبرؐ کی وہ حدیثیں بھی متواتر صورت سے موجود تھیں کہ میرے بعد بارہ جانشین میرے ہونگے اور یہ تعداد خود اُن غلط مدعیوں کے دعوے کے بطلان کے لیے کافی تھی لیکن اب جبکہ امام حسن عسکری تک گیارہ کی تعداد پوری ہوگئی تو دنیا بیچینی کے ساتھ اُسی امام کی طالب ہوگی جو اپنی پیدائش کے قبل بھی منتظر تھا اور پیدائش کے بعد بھی غیبت کی بنا پر مصلحت الٰہی کے تقاضا تک منتظر رہنے والا تھا۔

ولادت

وہ وقت جسکا سب کو انتظار تھا آخر آہی گیا اور پندرہ شعبان ۲۵۵ھ رات کو سامرے میں اس مبارک مقدس بچے کی ولادت ہوئی امام حسن عسکریؑ نے اس موقع پر کافی مقدار میں [illegible] تقسیم کیا اور عقیقہ میں کئی بکریوں کی قربانی فرمائی

نشو و نما اور تربیت

ائمۂ اہلبیت میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ اُن کو ظاہری حیثیت سے تعلیم و تربیت کا موقع حاصل نہ ہو سکا ہو اور وہ بچپن ہی میں قدرت کی طرف کے انتظام خاص کے ساتھ کمالات کے جوہر سے آراستہ کر کے امامت کے درجہ پر فائز کر دیئے گئے ہوں۔
اسکی نظیریں حضرت امام منتظر کے پہلے بھی کئی سامنے آ چکی تھیں جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ جنکی عمر اپنے والد امام محمد تقیؑ کی وفات کے وقت چھ برس اور چند مہینے سے زیادہ نہ تھی اور اسکے پہلے امام محمد تقیؑ جنکی عمر اپنے والد امام رضاؑ کے انتقال کے وقت آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی ظاہر ہے کہ یہ مدت عام افراد کے لحاظ سے بظاہر اسباب نشو و نما اور تعلیم و تربیت کیلئے ناکافی ہے مگر جب خالق کی مخصوص عطا کو ان حضرات کے بارے میں تسلیم کر لیا تو ایک دو یا پانچ برس کے فرق کا بھی کوئی سوال باقی نہیں رہ سکتا اگر سات برس کے سن میں امامت کا منصب حاصل ہو سکتا ہے اور چھ برس کے سن میں حاصل ہو سکتا ہے جسکی نظیریں قبل کے اماموں کے یہاں دنیا کی آنکھوں کے سامنے آ چکیں تو پانچ یا چار برس میں بھی یہ منصب اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔
بارھویں امام کو اپنے والد کی آغوش شفقت سے تربیت بہت کم عمر میں جدا ہونا پڑا یعنی شعبان ۲۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ربیع الاول ۲۶۰ھ میں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکریؑ کی وفات ہو گئی اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ کی عمر اسوقت صرف ساڑھے چار برس کی تھی اور اسی سن میں آپ کے سر پر خالق کی طرف سے امامت کا تاج رکھ دیا گیا۔

حکومت وقت کا تجسس

بالکل اسی طرح جیسے فرعون مصر نے پیشین گوئی سن لی تھی کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا ایک بچہ میرے ملک کی تباہی کا باعث ہوگا تو اس نے اس کی کوشش شروع کی کہ وہ بچہ کسی طرح پیدا ہی نہ ہونے پائے اور

پیدا ہو تو زندہ نہ رہنے پائے اسی طرح متواتر احادیث کی بنا پر عباسی سلطنت کے فرمانرواؤں کو یہ معلوم ہو چکا
تھا کہ حسن عسکریؑ کے یہاں اُس مولود کی پیدائش ہوگی جسکے ذریعہ باطل کی حکومتیں تباہ ہو جائیں گی
تو اسکی طرف سے انتہائی شدت کے ساتھ انتظامات کیے گئے کہ ایسے مولود کی پیدائش کا امکان باقی
نہ رہے اسی لیے امام حسن عسکریؑ کو مسلسل قید و بند میں رکھا گیا مگر قدرت الٰہی کے سامنے دنیا کی بڑی سے
بڑی مادی طاقت بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جس طرح فرعون کی تمام کوششوں کے باوجود موسیٰ پیدا ہو گئے اسی طرح سلطنت عباسیہ
کے تمام انتظامات کے باوجود امام منتظرؑ کی ولادت ہوئی۔ مگر یہ قدرت کی طرف کا انتظام تھا کہ آپکی پیدائش کو
صیغۂ راز میں رکھا گیا لیکن جب قدرت پنہاں رہنے کے آپکے گرفتار ہونے کا قوی اندیشہ تھا تو ایک دیر
کے لیے خود اسکی مصلحت اسکی متقاضی ہوئی کہ راز سے پردہ ہٹا دیا جائے جب امام حسن عسکریؑ کا جنازہ
غسل و کفن کے بعد نماز جنازہ کیلئے رکھا ہوا تھا شیعیان خاص کا مجمع تھا اور نماز کیلئے صفیں درست ہو چکی تھیں امام
حسن عسکریؑ کے بھائی جعفر نماز جنازہ پڑھانے کیلئے آگے بڑھ چکے تھے اور تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک دم
حجرۂ امامت سے ایک کمسن بچہ برآمد ہوا اور بڑھتا ہوا صفوں کے آگے پہنچا اور جعفر کی عبا کو ہاتھوں میں لیکر
کہا چچا پیچھے ہٹیے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانے کا حق مجھے زیادہ ہے جعفر بے ساختہ پیچھے ہٹے اور صاحبزادہ
نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی پھر صاحبزادہ حرم سرا میں واپس گیا غیر ممکن تھا کہ یہ خبر خلیفۂ وقت کو نہ پہنچتی
چنانچہ پہنچی اور اب زیادہ شدت و قوت کے ساتھ تلاش شروع ہو گئی کہ ان صاحبزادہ کو گرفتار کر کے
قید کر دیا جائے یا اُن کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔

غیبت

حضرت امام منتظرؑ کی امامت کا زمانہ اب تک دو غیبتوں پر تقسیم رہا ہے ایک زمانہ "غیبت
صغریٰ" اور ایک "غیبت کبریٰ" اسکی بھی خبر معصومین کی زبان پر پہلے آ چکی

تھی جیسے پیغمبر خدا ص کا ارشاد "اسکے لیے ایک غیبت ہوگی جسمین بہت سی جماعتین گمراہ ہو جاتی رہینگی اور اُس کی غیبت کے زمانہ میں اسکے اعتقاد پر برقرار رہنے والے "کوگرد سُرخ" سے زیادہ نایاب ہونگے" حضرت علی ابیطالب کا ارشاد ہے "قائم آل محمد کیلئے ایک طولانی غیبت ہوگی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے وہ منظر کہ دوستان اہلبیت اسکی غیبت کے زمانہ مین سرگردان پھر رہے ہین جسطرح جانور چراگاہ کی تلاش مین سرگردان پھرتے ہین"۔

دوسری حدیث مین "اسکا ظہور ایک ایسی غیبت و حیرانی کے بعد ہوگا جس مین اپنے دین پر صرف با اخلاص اصحاب یقین ہی قائم رہ سکینگے" امام حسن کا قول "اللہ اسکی عمر کو اُس کی غیبت کی حالت مین طولانی کریگا"۔

امام حسین کا ارشاد "اسکی ایک غیبت ہوگی جس مین بہت سی جماعتین گمراہ ہوجائینگی"

امام محمد باقر کا ارشاد "اسکی غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ بہت سے گمراہ ہوجائینگے"۔

امام جعفر صادق نے فرمایا "مہدی ساتوین امام کی اولاد مین پانچوان ہوگا اسکی ہستی تمہاری نظروں سے غائب رہیگی" دوسری حدیث مین "صاحب الامر کے لیے ایک غیبت ہونے والی ہے اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقیہ اختیار کرے اور اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے"۔ امام موسی کاظم فرماتے ہین "اسکی صورت لوگون کی نگاہون سے غائب ہوگی مگر اسکی یاد اہل ایمان کے دلون سے غائب نہ ہوگی وہ ہمارے سلسلہ کا بارھوان ہوگا"۔ امام رضا "اسکی غیبت کے زمانہ مین اسکا انتظار رہیگا"۔ امام محمد تقی "مہدی وہ ہے جسکی غیبت کے زمانہ مین اسکا انتظار اور ظہور کے وقت پر اسکی اطاعت لازم ہوگی"۔ امام علی نقی "صاحب الامر وہ ہوگا جسکے متعلق بہت سے لوگ کہتے ہونگے کہ وہ ابھی پیدا ہی نہین ہوا"۔ امام حسن عسکری "میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوا اُن لوگون کے جنھین اللہ محفوظ رکھے سب شک و شبہہ مین مبتلا ہوجائینگے"۔ اسی کے ساتھ امام محمد باقر نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ "قائم آل محمد کیلئے دو غیبتین ہین ایک بہت طولانی اور ایک اسکی بہ نسبت مختصر"۔

امام جعفر صادق نے فرمایا کہ "ایک دوسرے کی بہ نسبت بہت طولانی ہوگی"۔ انھی احادیث کے پہلے سے موجود ہونے کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکری کے بعد انکے اصحاب و مومنین مخلصین کسی شک و شبہہ مین مبتلا نہین ہوے

اور انھوں نے کسی حاضر الوقت مدعی امامت کو تسلیم کرنے کے بجائے امام غائب کے ظہور کے لئے تصدیق کی
پہلی غیبت کا دور ۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک ستر سال قائم رہا۔ اس میں سفراء

غیبت صغریٰ

خاص ہوتے تھے یعنی ایسے حضرات جنکو مخصوص طور پر نام کی تعیین کے ساتھ امام
کی جانب سے نائب بنایا گیا تھا کہ وہ شیعوں کے مسائل امام تک پہونچائیں انکے جوابات حاصل کریں
اموال زکوٰۃ و خمس کو جمع کر کے انہیں مصارف خاصہ میں صرف کریں اور جو قابل اعتماد اشخاص ہوں ان تک
خود امام کی تحریرات کو بھی پہونچا دیں بلکہ خود حضرت سے دریافت کر کے انکے مسائل کا جواب دیدیں
یہ حضرات علم و تقویٰ اور راز داری میں اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ ممتاز اشخاص تھے یہی وجہ ہے کہ امام ع
کی جانب سے اس خدمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حسب ذیل چار بزرگوار تھے۔

(۱) ابو عمرو عثمان بن سعید بن عمرو عمری اسدی۔ یہ پہلے امام علی نقیؑ کے بھی سفیر رہے تھے پھر امام حسن عسکریؑ
کے زمانہ میں بھی اس خدمت پر مامور رہے اور پھر حضرت امام منتظر کی جانب سے بھی سب سے پہلے اس عہدہ
پر یہی قائم ہوئے۔ چند سال اس خدمت کو انجام دیکر بغداد میں انتقال کیا، وہیں دفن ہوئے۔

(۲) انکے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید عمری۔ امام حسن عسکریؑ نے انکے صدق و دیانت پر مقرر ہونے کی خبر
پہلے ہی دی تھی انکے والد کی وفات کے وقت بحکم امام انکی نیابت کا اعلان کیا۔ جمادی الاول ۳۰۵ھ
بغداد میں وفات پائی

(۳) ابو القاسم حسین بن روح بن ابی بحر نوبختی۔ علم و حکمت کلام و نجوم میں خاص امتیاز رکھتے ہوئے مشہور
خاندان نوبختی کی یادگار اور خود بڑے جلیل المرتبت پرہیزگار عالم تھے۔
ابو جعفر محمد بن عثمان نے اپنی وفات کے پہلے امام کے حکم سے ان کو اپنا قائم مقام بنایا تھا ۲۱ برس
عہدہ سفارت انجام دینے کے بعد شعبان ۳۲۶ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی

آنریری سکریٹری

امامیہ مشن لکھنؤ

رسالہ نمبر ۱۱۰

امامیہ مشن لکھنؤ

(مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ)